قیمت ۸ روپے



"اب وقت آگیا ہے کہ دستور پر اسلامی نقطہ نظر سے نظر ثانی کی جائے" ـــــ قائد ملی

انٹرنیشنل
ملی ٹائمز
نئی دہلی

ہندوستانی مسلمان نیوکلیائی دھماکہ پر کیسا محسوس کرتے ہیں؟



AUSTRALIA	A$ 4.50	DENMARK	D.KR. 17.00	ITALY	LIT. 4000	NEW ZEALAND	NZ$ 5.00	SRILANKA	Rs. 50
BANGLADESH	Taka 25	FRANCE	Fr 13	JAPAN		NORWAY	N.Kr 15.00	SWEDEN	Kr 20
BELGIUM	Fr 90	FINLAND	F.MK 13.00	KOREA	W 2.200	PAKISTAN	Rs. 20	SWITZERLAND	Fr 4
BRUNEI	B$ 5.50	GERMANY	DM 4.50	MALAYSIA	RM 4.00	PHILIPPINES	P 30	THAILAND	B 50
CANADA	C$ 4.50	HONG KONG	HK$ 19.00	MALDIVES	Rf 15.00	SAUDI ARABIA	SR 4	U.K.	£ 2.00
CHINA	RMB 16.00	INDONESIA	RP 4,500 (INC PNN)	NETHERLANDS	G 4.30	SINGAPORE	S$ 3.50	U.S.A.	US $ 3.50

آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مجبور کو نظام جبر سے نجات دلانے کے لئے

اور

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلابی پیغام کو چہار دانگ عالم میں عام کرنے کے لئے

اب

قائد ملی پارلیامنٹ ڈاکٹر راشد شاذ بہ نفس نفیس

ملک بھر میں

سیرتؐ کے عظیم الشان جلسوں سے خطاب فرمائیں گے

دنیا کے مختلف ملکوں اور ملک کے مختلف گوشوں میں سرکار دو عالمؐ کے نام کا غلغلہ بلند کرنے کے لئے ایک جامع پروگرام تشکیل دیا جارہا ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ کوئی بھی قابل ذکر علاقہ سرکارؐ کے پیغام کی گونج سے خالی نہ رہ جائے۔ سال بھر کے لئے ملک گیر سفر کا تفصیلی نقشہ ترتیب دیا جارہا ہے۔ اگر آپ بھی اپنے علاقے کو اس فہرست میں شامل کرنا چاہتے ہیں تو جلد از جلد رابطہ کیجئے۔

یاد رکھئے! سیرت کا جلسہ ایک بڑا اعزاز ہے آپ بھی یہ سعادت حاصل کیجئے! اور اس ملک کو سرکارؐ مدینہ کے رنگ میں رنگ دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیجئے۔

اللہ کی نصرت اور اس کے رسولؐ کی قیادت آپ کے ہمراہ ہے۔

Milli Parliament
Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar New Delhi - 25
Phone : (011) 6827018/6926246 Fax : (011) 6946686

انٹرنیشنل

ملی ٹائمز

نئی دہلی

جون تا جولائی ۱۹۹۸ء

قیمت: آٹھ روپے

سالانہ زر تعاون: ۱۰۰ روپے

بیرون ممالک سے: ۲۵ امریکی ڈالر

سالانہ زر تعاون منی آرڈر یا ڈرافٹ ارسال کریں

ڈرافٹ پر صرف اتنا لکھیں

Milli Times International New Delhi

اس شمارے میں

یکے از مطبوعات مسلم میڈیا ٹرسٹ

ایڈیٹر: محمد احمد سعید

ملی ٹائمز انٹرنیشنل

ابو الفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-25

فون: 6926246 / 6827018

فاکس: (011) 6946686

اداریہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

احباب کو شکایت ہے کہ ملی ٹائمز کے صفحات ان کے اندرونی سکون کو درہم برہم کئے دیتے ہیں حتی کہ وہ لوگ بھی جنہوں نے پر سکون زندگی جینے کی ساری کتابیں پڑھ رکھی ہیں اور جنہیں کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہ اب کامیابی کے رن وے پر ٹیک آف کرنے والے ہیں۔ ان جیسے لوگوں کو بھی یہ شکایت ہے کہ ہماری تحریریں ان کے جمے جمائے فکری سانچے کو ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے دوچار کر دیتی ہیں۔

ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم چیزوں کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہتے ہیں جہاں سے زندگی میں معنویت پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے اور آپ کے درمیان جھگڑا حقیقت کو پالینے کا نہیں بلکہ اس کو صحیح تناظر فراہم کرنے کا ہے۔ وہ لوگ جو بے گھر کر دیئے گئے یا جو تارکین وطن کی حیثیت سے مہاجر کیمپوں میں اپنی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، وہ اگر یہ محسوس کرنے لگیں کہ ان کا ترک وطن دراصل پکنک کا سا لطف دیتا ہے اور یہ کہ مہاجر کیمپوں میں تفریحی اور سیاحتی مقامات کا سا لطف ہے تو اسے یقیناً تناظر کی غلطی سے تعبیر کیا جائے گا۔

ہمیں ہر لحہ اس ملک میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے حالات کے دباؤ میں ہمارا ذہنی فکری سانچہ مسخ ہوتا جارہا ہو۔ چیزیں اپنی اصل ماہیت میں نظر نہیں آتیں اس لئے کہ کریہہ، بدصورت اشیاء پر رنگ و نور کے شعاعوں کی مسلسل یورش ہے۔ ہاؤ ہو کے تماشے میں انسانوں کا اصل درد و کرب کہیں دب کر رہ گیا ہے۔ لیکن مجھے نہ جانے کیوں ایسا لگتا ہے جیسے انسانی تھیٹر سے اچانک بجلی چلی گئی ہو، جیسے شدید گرمی کے باعث کسی بدصورت عورت کا میک اپ پگھل رہا ہو۔

کبھی کبھی مجھے ان لوگوں کی بے ضرر خوش بختی پر پیار آتا ہے۔ جو زندگی کو کچھ اس دھوکے سے دیکھتے ہیں جیسے وہی سب کچھ حقیقت ہو۔ زندگیاں گزر جاتی ہیں لیکن ان بے چاروں پر دنیا کی رنگینیوں کا تاثر کچھ اس طرح قائم رہتا ہے جیسے موسیقی کے کسی اسٹیج پر بدلتی روشنیوں کا جھوٹا ہالہ۔ چوں کہ ان کی زندگی میں شارٹ سرکٹ کا کوئی حادثہ پیش نہیں آتا اس لئے یہ بے چارے اس مصنوعی کیفیت کو زندگی جانتے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ہر لحہ ہمارے اندرون میں اسپارک ہو رہا ہو۔

مجھے اپنے چھوٹے سے گھر کی یاد آتی ہے، جیسے ہوسٹل میں رہنے والا کوئی معصوم بچہ ماں باپ اور وطن کی یاد کر کے بلک اٹھتا ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب Home Sickness ہے لیکن میں تو سدا سے اس کیفیت کا شکار ہوں۔ جب سے خلافت کا ادارہ تباہ ہوا ہے مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں No Man's Land میں آپڑا ہوں۔ نہ میرا کوئی ملک ہے نہ شہریت میں جس نظام کا حصہ تھا اور جس ملک کی شہریت اختیار کر رکھی تھی، وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا۔ میرے پیروں سے زمین نکل چکی ہے۔ میں خود کو ہر لحہ ہوا میں معلق محسوس کرتا ہوں۔

لوگ کہتے ہیں تم خواہ مخواہ تناظر کی درستگی میں لگے ہوئے ہو ورنہ اس دنیا میں لوگوں کی دنیا بھی بن رہی ہے اور آخرت بھی۔ آخر بڑے بڑے اہل تقوی اسی نظام کے اندر پر سکون اسلامی زندگی جی رہے ہیں۔ جب سہولت سے تقوی کی روش پر چل نکلنا ممکن ہو تو کیا ضروری ہے کہ ثواب کی ذخیرہ اندوزی کا آسان نسخہ چھوڑ کر نظام کفر سے ٹکر لینے کی بات کی جائے۔

جب حالات سخت ہو جاتے ہیں اور نظام کفر کے استبدادی پنجوں کے نوکیلے ناخون میری کلائی میں چبھتے محسوس ہوتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے میرے اندرون میں وساوس کی یلغار کر دی ہو، جیسے ایک لمحے کے لئے اوروں کی طرح مجھے بھی سب کچھ ٹھیک ٹھاک لگنے لگا ہو۔ لیکن پھر اچانک بجلی چلی جاتی ہے اور ارد گرد کی تمام اشیاء اپنی اصل ماہیت میں نظر آنے لگتی ہیں۔ میں ہر لحہ اس وسوسے سے ڈرتا ہوں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ہمارے قارئین اس وسوسے سے کس حد تک پیچھا چھڑا پاتے ہیں۔

ادارہ

علماء بے زاری کا الزام

مکرمی۔ سلام مسنون! مئی کا رسالہ نظر سے گزرا۔ رسالے کے کئی مضامین میں جو ایک خاص بات محسوس ہوئی وہ ہے علماء سے بے زاری اور لعن طعن، تنقید و تبصرہ۔ خدا کے لئے قلم کو جذبات و احساسات کا شعلہ نہ بنائیں۔ جن کی آہ سحر گاہی سے ہزاروں دلوں کی آبیاری ہوتی ہے، جن کے آباء و اجداد نے جہاد کا عملی نمونہ کر کے دکھایا ہے۔ کبھی کربلا میں، کبھی بالاکوٹ میں، ان پر ان لوگوں کو تنقید کا کوئی حق نہیں جن کا ایک قطرہ خون بھی ابھی تک قوم وملت کے لئے نہیں گرا ہے۔ افسوس صد افسوس آج کل بہت سے سرپھرے قوم وملت کے ہمدرد بن گئے ہیں۔ باطن سے بھیڑیے پاسبانی کا، رہنمائی کا، قائد بننے کا دم بھر رہے ہیں اور جو رات دن قوم کے غم میں رہتا ہے اس پر لعن طعن ہورہی ہے۔ جس کا ہاتھ وقت کی نبض پر ہے اس کو برا بھلا کہا جارہا ہے۔ یہ اعلان جنگ ہے اللہ سے۔ افسوس صد افسوس جو عادات و کردار بزرگوں کی امانت کے طور پر ہم تک آئی ہے اس کو برا کہا جارہا ہے۔ حضرت معین الدین چشتی، حضرت بابا فرید الدین گنج شکر، حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی، جو شمع ہندوستان میں جلا گئے ہیں جس سے کتنے دلوں کو اسلام و ایمان کی روشنی ملتی ہے اس کو بجھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یاد رکھئے اللہ کی رحمت اور جمال کا جو نمونہ ہم کو ملا ہے اس پر لعن طعن کیا گیا تو اللہ کا ایسا جلال آئے گا جو تباہی کا باعث بنے گا۔ والسلام

الف۔ الف۔ خاں۔ مہاتما گاندھی مارگ۔ لکھنو

بھارت کا مسلمان

مکرمی۔ بھارت کا مسلمان آج ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں اسے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اپنی آئندہ نسلوں کو فکری غلامی سے بچانا ہے یا انہیں اسلام کے دامن پر ایک شرمناک داغ بنادینا ہے؟ یہ پچاس سالہ دور آزادی حقیقی معنوں میں مسلمانوں کے لئے بدترین غلامی کا دور ہے۔ غلامی کی سب سے بدترین قسم وہ ہوتی ہے جس میں غلام خود کو آزاد تصور کرنے لگتے ہیں۔ غلاموں میں جب تک یہ احساس زندہ رہتا ہے کہ وہ غلام ہیں تبھی تک یہ امکان باقی رہتا ہے کہ ضرور ایک دن وہ اپنی بیڑیوں کو کاٹنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن جب یہ احساس مرجاتا ہے تب آزادی کی ہر امید بھی ختم ہوجاتی ہے۔

آزادی کی اہمیت اس لئے ہے کہ قومیں اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرسکیں۔ کوئی دوسری قوت ان کا استحصال نہ کرسکے۔ ان کی جان اور مال محفوظ رہے۔ لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں کو مسلسل استحصال کا شکار بنایا گیا ہے۔ گذشتہ پچاس سالوں میں بائیس ہزار بار ان کا منظم قتل عام ہوا ہے، جن میں لاکھوں مسلمان ہلاک ہوئے۔ کھربوں روپے مالیت کی جائیدادیں اور اثاثے لوٹ لئے گئے۔ یہ سب سیکولر حکمرانوں کی ناک کے نیچے ہوا۔ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ ان میں پولیس اور سیکورٹی فورس کے جوان شامل پائے گئے۔

آزاد قوموں کی اپنے ملک میں عزت ہوتی ہے۔ کیا مسلمانوں کی بھی عزت ہے؟ غدار، وطن فروش، غنڈہ، دہشت گرد، بنیاد پرست، فرقہ پرست غرضیکہ ذلیل اور حقیر ثابت کرنے والا وہ کون سا لقب ہے جس سے مسلمانوں کو نہ نوازا گیا ہو؟ لفظ مسلمان کے ساتھ اقلیت کا لفظ مستقل طور پر چسپاں کردیا گیا۔ بظاہر یہ کم تعداد کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن واقعتاً اس میں حقارت کا عنصر غالب ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام حقوق ہندوؤں کی مرضی پر منحصر ہے کیونکہ جمہوریت میں اکثریت کا ہی راج ہوتا ہے اور ہندو قیامت تک کے لئے مستقل اکثریت رہے گی اور مسلمان قیامت تک مستقل اقلیت بن کر ان کی تابع داری کرتے رہیں گے۔ یہ لفظ اقلیت شودر کے ہی ہم معنی ہے۔ شودر بھی حکومت کرنے کا اختیار نہیں رکھتا تھا، اقلیت بھی نہیں رکھتی۔ افسوس کہ جس طرح ہریجنوں نے اپنے لئے لفظ شودر پسند کرلیا تھا اسی طرح سادہ لوح مسلمانوں نے بھی لفظ اقلیت کو قبول کرلیا ہے۔ یعنی وہ خود اس بات کا اعتراف کررہے ہیں کہ اقتدار میں آنے کا انہیں کوئی حق نہیں ہے۔ جمہوریت میں اقلیت کو کون پوچھتا ہے؟

کتنا عجیب تماشہ ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کا استحصال کررہے ہیں انہیں کو اقتدار میں لانے کے لئے وہ اپنا کندھا فراہم کررہے ہیں۔

محمد اشرف لاری۔ لار۔ دیوریا

نوگاؤں المیہ، ہندتو کے عہد کی آمد آمد

بی جے پی کے کرسی اقتدار پر متمکن ہونے کے بعد ملک کے حالات نئی کروٹ لے رہے ہیں۔ اسی کے دور حکومت نوگاؤں راجستھان کے مسلمانوں پر کیا کچھ گزر چکا ہے، وہ ملت کے لیے آنے والے دور کی ایک تصویر ہے۔ برہمنت کے ان ٹھاکروں نے اب تک اپنی امن پسندی کا ڈھنڈورا بڑے شد ومد کے ساتھ پیٹا تھا، عوام کے ذہنوں میں یہ بات ڈالنے کی کوشش کی گئی کہ بی جے پی کے دور میں فسادات نہیں ہوں گے، کرپشن نہیں ہوگا لیکن صوبہ راجستھان کے چھوٹے سے قصبہ نوگاؤں کے مسلمانوں کو بی جے پی کی حکومت کی دیکھتی آنکھوں جو کچھ ہوا وہ ان کے اسی پروپیگنڈے کا پول اچھی طرح کھول دیتا ہے۔ قومی پریس تو اس پورے المیہ کو ہضم کرگیا۔ اسے اس پر کوئی ملال و کرب تو ہوا نہیں ہوگا کہ اس کے شکار سب مسلمان ہی تھے، انہیں کو لوٹا گیا، زندہ جلایا گیا، قتل کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس بات کو برہمنی پریس کیسے منظر عام پر لے آتا۔ عینی شاہدین کے مطابق نوگاواں چتوڑگڈھ کے چھوٹے سے قصبے میں ۴۰ پٹھان مسلمان آباد تھے، باقی آبادی ہندوؤں کی ہے جس میں بیشتر سنگھ پریوار سے وابستہ لوگ ہیں۔ ۱۳ اپریل ۱۹۹۸ء کو مقامی سنگھ صدر کے لڑکے بنسی لال اور ایک ۱۷ سالہ مسلمان لڑکے عمران کے مابین ایک آبائی زمین کو لے کر کچھ تنازعہ ہوگیا بس اسی واقعہ کو بنیاد بناکر صرف ایک گھنٹہ بعد ہی آس پاس کے علاقے سے کئی ہزار ہندوؤں کا تلواروں، لاٹھیوں اور پٹرول بوتلیں لے کر نوگاؤں کے نہتے اور قلیل تعداد مسلمانوں پر حملہ آور ہوگیا۔ ان کے تمام تر گھروں، کھلیانوں میں آگ لگادی گئی۔ جو بھی ملا اسے قتل کردیا یا زدوکوب کرکے ادھ مرا کرکے چھوڑ دیا گیا۔ نوگاؤں اور قریب کے قصبہ ارنود کے سارے مسلمان یا تو چن چن کر قتل

کردگئے یا انہیں جان بچاکر بھاگنا پڑا۔ اس پورے شیطانی کھیل کا المناک پہلو یہ ہے کہ پولیس عین موقع سے پہنچ گئی تھی لیکن اس نے نوگاؤں کے مسلمانوں کو گھروں میں محصور کیے رکھا اور دوسری طرف مسلح ہجوم تیار فصلوں، باغات وغیرہ کو آگ لگاکر گاؤں میں گھس گیا جسے پولیس نے روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ گویا وہی صورت ہوئی کہ

داد دیجئے کہ ہم جی رہے ہیں وہاں
ہیں محافظ جہاں قاتلوں کی طرح

اجڑے اور لٹے ہوئے ۱۲ مسلم خاندانوں کی کہانی ایک ہی جیسی ہے۔ ۶۵ سالہ بوڑھی تاج بیگم اپنے بوڑھے شوہر اور ذہنی طور پر معذور بچے کے ساتھ نوگاؤں سے قریب ہی کھیتوں کے درمیان بنے اپنے مکان میں تھے۔ حملہ آوروں کے ہجوم نے دونوں میاں بیوی کو زدوکوب کرکے بوڑھی خاتون کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی، بوڑھے شوہر کے ہاتھ پیر اور پسلیاں توڑ دیں، ان کا کل اثاثہ چھین لینے کے بعد گھر میں آگ لگادی اور معذور بیٹے کو گھسیٹ کر اسی آگ میں جھونک دیا۔ گاؤں کے کم سن امام عبد الرحمن کو مسجد سے نکال کر قرآن سمیت لحاف میں لپیٹ اور اسی حالت میں ایک پرانے ٹائر پر رکھ کر مٹی کا تیل چھڑکا اور ان کو زندہ نذر آتش کر دیا گیا۔ بھارت ماتا کے ان سپوتوں نے اسی حالت میں ان کے فوٹو بھی لیے۔ کیسر یا سیکولر بھارت اجمیر، جے پور، مراد آباد کے بعد ان نوگاؤں بھی ہندتو کے عفریت کے لیے نرم چارہ بن گیا ہے۔ بی جے پی کے امن و شانتی پسند ہونے کا ڈھنڈورا پیٹنے والے کہاں ہیں؟

ہم سایوں سے ہم وطنوں سے لاشیں پوچھا کرتی ہیں
پیار کی باتیں کرنے والو قاتل کیوں بن جاتے ہو؟

عبدالغفار ازہری، میرٹھ

ہندوستان میں اسلام کے وجود کو خطرہ

مکرمی۔ حکومت اتر پردیش نے جولائی ۱۹۹۸ء سے ایک ایسی تعلیمی پالیسی کا نفاذ کیا ہے کہ ہر گورنمنٹ اسکول اور گورنمنٹ امداد شدہ ادارے پر لاگو ہوگی اس کے تحت مسلمان بچوں کو شرک و کفر میں مبتلا کرنے کی ایک بہت گہری سازش رچی ہے۔ اس حکم کے مطابق ہر بچہ بلاتفریق مذہب و ملت اپنے گھر سے پھول لائے گا۔ اسکول کی شروعات بچوں سے بھارت ماتا دیوی پر پھول چڑھانے، پوجا ارچنا و دیش وندنا کرنے اور بندے ماترم گیت گاکر ہوگی۔ بچوں کو حاضری کے جواب میں وندے ماترم کہنا ہوگا۔ دوپہر میں کھانا کھانے سے قبل بھوجن منتر کا جاپ کرنا ہوگا اور اسکول کے اختتام میں وندے ماترم کا گیت گانا ہوگا۔ اسکول کو آشرم کی شکل دی جائے گی۔ کلاسوں کے نام مہاپرشوں کے نام پر رکھے جائیں گے اور سنسکرت جس میں ہندومت کا پرچار ہے تیسرے درجے سے لازمی طور پر پڑھنا ہوگا۔

اس سازش کا دوسرا اور چھپا ہوا پہلو یہ بھی ہے کہ مسلمان بچے اس سازش کا شکار ہوکر یا تو ہندو مذہب اختیار کرلیں یا پھر ان کو تعلیم سے بالکل بے بہرہ کر دیا جائے تاکہ وہ نہ تو کوئی اچھی نوکری حاصل کر سکیں اور نہ ہی بیوپار میں کامیاب ہو سکیں۔ نتیجہ کے طور پر ان کو نیچے درجے کا کام کرنا پڑے اور خود ہی اپنی بدحالی کا ذمہ دار اسلام کو ٹھہرائیں۔ اس سے عوام میں اسلام سے نفرت پیدا ہو جائے گی اور اسلام سرزمین ہند سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ جائے گا۔

یہ تعلیمی سازش حب الوطنی کے سنہرے ٹائٹل کے تحت کی جارہی ہے۔ ذرا سوچئے کہ وطن سے محبت کا تقاضا یہ تو نہیں ہے کہ اس کی پوجا کی جائے۔ مثال کے طور پر والدین اپنی اولاد سے شدید محبت کرتے ہیں لیکن ان کی پوجا نہیں کرتے۔ جہاں تک حب الوطنی کا سوال ہے، بہادر شاہ ظفر، ٹیپو سلطان، بیگم حضرت محل جیسے حکمراں، مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد جیسے علماء حب الوطنی کی ایسی جیتی جاگتی مثالیں ہیں جس کو تاریخ ہند تاقیامت بھلا نہیں سکتی۔ اس کے برعکس ملک سے غداری، خفیہ کاغذات اور راز کا بیوپار، مہاتما گاندھی، اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کی ہتیا کرنے والے لوگ اسی چہیتی قوم کے افراد ہیں جس کی وطن پرستی کا ڈھنڈورا پیٹا جارہا ہے۔ دراصل حب الوطنی کے نام پر مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور کفر و شرک میں مبتلا کرنے کی سازش کی جارہی ہے۔ اگر ہم ان کے دھوکے میں آگئے اور اسلام کی بقاء و تسلسل کے لئے جدوجہد نہ کی تو یاد رکھئے اسلام سرزمین ہند سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ جائے گا جس کے ذمہ دار ہم اور آپ ہوں گے۔

اس سلسلے میں علماء و دانشور حضرات سے گذارش ہے کہ ایک ایسا لائحہ عمل تیار کریں جس پر گامزن ہوکر مسلمان اپنے بچوں کو کفر و شرک سے بچا سکیں

عبداللہ۔ انجمن تحفظ اسلام۔ رائے بریلی روڈ۔ لکھنؤ

گھپ اندھیرے میں ایک دیا

محترم ایڈیٹر صاحب!

دو روز قبل ایک طویل مدت کے بعد ملی ٹائمز کو رسالے کی شکل میں پایا۔ دیکھ کر انتہائی مسرت ہوئی کیونکہ دو برس قبل جب ملی ٹائمز کی شروعات کے تین شماروں کو پڑھنے کا موقعہ ملا تھا تو یوں محسوس ہوا تھا کہ موقعہ پرستی اور ذہنی محکومی کے گھپ اندھیرے میں حقیقت پسندی اور حق شناسی کا ایک دیا روشن ہوا ہے تاہم جب مسلسل تلاش کے بعد بھی کہیں سے ملی ٹائمز کا چوتھا شمارہ دستیاب نہ ہوا تو مجھے لگا کہ شاید ملت اسلامیہ کا ایک خیر خواہ جریدہ اپنوں اور غیروں کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہوکر دم توڑ بیٹھا۔ الحمد للہ دو روز قبل جب سوپور میں ایک اخبار فروش کی دوکان پر ملی ٹائمز کو ایک جریدے کی شکل میں آویزاں پایا تو میری حالت قابل دید تھی۔ گو کہ اپریل کے شمارے کے ساتھ ایک مفت شمارہ بھی تھا لیکن مذکورہ اخبار فروش نے یہ کہہ کر "کہ یہ صرف لکھنے کی باتیں ہوتی ہیں" دوسرا شمارہ دینے سے انکار کیا۔ پھر بھی میں نے فوراً پیسے نکال کر ملی ٹائمز کی ایک کاپی ان سے حاصل کی۔

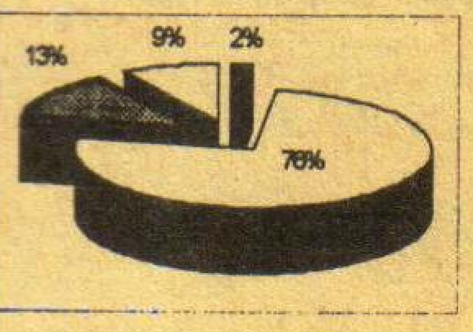
جاوید جواد۔ کشمیر یونیورسٹی، سرینگر

ہندوستانی مسلمان ایٹمی دھماکے پر کیسا محسوس کرتے ہیں

اس ملک میں جب کوئی نیا اسلحہ ایجاد ہوتا ہے تو ملک کے دبے کچلے بے بس مسلمانوں کے اعصاب پر خوف کی ایک اور پرت چڑھ جاتی ہے۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جابر حکمرانوں کے ہاتھوں میں اب ایک اور پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور ہتھیار آگیا ہے۔ یقیناً ان کا استعمال بھی اب انہیں بے بسوں پر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں اگنی اور پرتھوی کے تجربے ہوتے رہے لیکن مسلمانوں کی طرف سے کسی مسرت کا اظہار نہ ہوا یہاں تک کہ ایٹمی دھماکے پر تو جمہور مسلمانوں کو ایسا لگا جیسے بابری مسجد کے دھماکے کے بعد اب یہ دوسرا دھماکہ خود ان کے وجود پر حملہ ہے۔ مسلمان اگر کسی ایسی کیفیت سے خود کو دوچار پاتے ہیں تو یقینا اس کی بعض بنیادی وجوہات ہیں۔ گذشتہ پچاس برسوں سے ہر لمحہ اس ملک میں مسلمانوں کی نسل کشی کا عمل جاری ہے۔ ہر لمحہ ان کے اوپر ایک نفسیاتی قتل عام کی فضا طاری ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر فسادات کا پھوٹ پڑنا اور ان فسادات میں پولیس کے ہاتھوں مسلمانوں کی منظم نسل کشی کا واقعہ اب ہر خاص و عام کے علم میں ہے۔ مراد آباد، ملیانہ، ہاشم پورہ، بھاگل پور اور ممبئی سیکیورٹی دستوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر جو کچھ بیتی، اب یہ واقعات بین الاقوامی ایجنسیوں کے توسط سے ہر خاص و عام کی معلومات کا حصہ ہیں۔

اس کے برعکس ایودھیا میں لاکھوں کے مجمع میں دن کی روشنی میں دنیا کی آنکھوں کے سامنے کھلے عام بابری مسجد کو زمیں بوس کردیا۔ عدالت عالیہ کے احکامات کی کھلے عام خلاف ورزی کی گئی اور انہدام کے نتیجے میں پورا ملک خطرناک خانہ جنگی کی زد میں آگیا لیکن ایودھیا میں امن و قانون کے لئے نہ کوئی گولی چلائی گئی اور نہ ہی کوئی شخص زخمی ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ جب ملک کے مختلف حصوں میں احتجاج کے لئے نہتے مسلمان سڑکوں پر نکل آئے تو انہیں پولس کی بربریت کا شکار بننا پڑا۔ شاہراہیں شہیدوں کے خون سے لالہ زار ہوگئیں۔ گذشتہ پچاس برسوں سے ریاستی پالیسی یہی تاثر دیتی رہی ہے کہ سیکیورٹی دستے اور ان کے ہاتھوں میں جدید ترین مہلک ہتھیار مسلمانوں کو زیر کرنے کے لئے ہیں۔

۔ ایٹمی دھماکے پر آپ کے فوری تاثرات کیا تھے؟



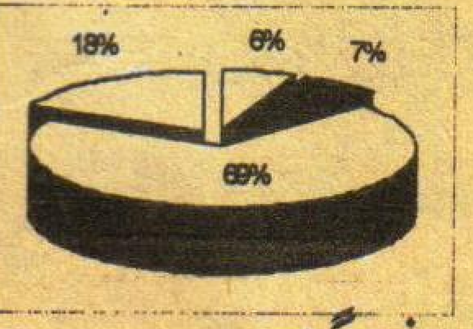
الف۔ آپ کو مسرت کا احساس ہوا۔ 2%

ب۔ آپ خوفزدہ ہوگئے۔ 76%

ج۔ آپ نے یہ محسوس کیا کہ کاش ایسا نہ ہوتا۔ 13%

د۔ نہیں معلوم۔ 9%

۲۔ نیوکلیائی دھماکہ کے بعد:



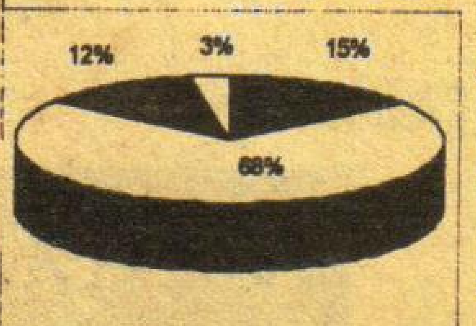
الف۔ آپ کا سر قومی افتخار سے اونچا ہوگیا۔ 6%

ب۔ آپ کو اپنے ہندوستانی ہونے پر شرم آنے لگی۔ 7%

ج۔ یہ محسوس ہوا کہ دھماکے سے ہندو احیاء پرستوں کا سر اونچا ہوگیا۔ 69%

د۔ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ 18%

۳۔ آپ نے نیوکلیائی دھماکے کی مخالفت میں زبان اس لئے نہیں کھولی کہ:



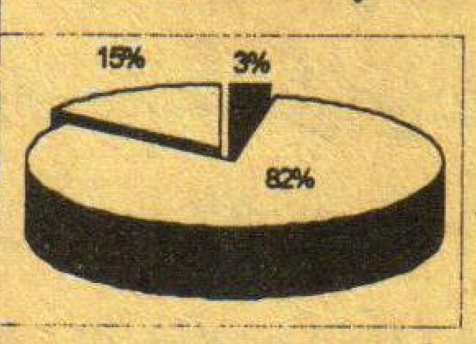
الف۔ آپ پر ملک دشمنی کا الزام عاید ہوجائے گا۔ 68%

ب۔ اس لئے کہ آپ کی مخالفت سے کچھ نہیں ہوگا۔ 17%

ج۔ کچھ کہنے کے لئے آپ مناسب وقت کا انتظار کررہے تھے۔ 12%

د۔ نہیں معلوم۔ 3%

۴۔ پاکستان یا کسی پڑوسی ملک پر نیوکلیر بم پھینکنے کے سلسلے میں آپ کا رد عمل کیا ہوگا؟

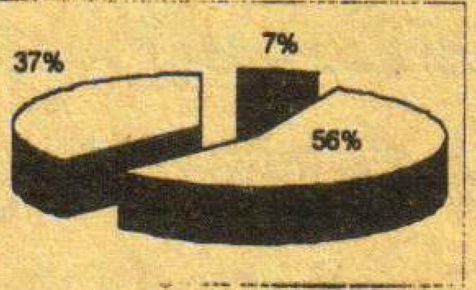


الف۔ حمایت کریں گے۔ 3%

ب۔ مخالفت کریں گے۔ 82%

ج۔ غیر متعلق رہیں گے۔ 15%

۵۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ملک کی سلامتی کے لئے نیوکلیائی دھماکہ ضروری تھا؟



الف۔ ہاں۔ 7%

ب۔ نہیں۔ 56%

ج۔ نہیں معلوم۔ 37%

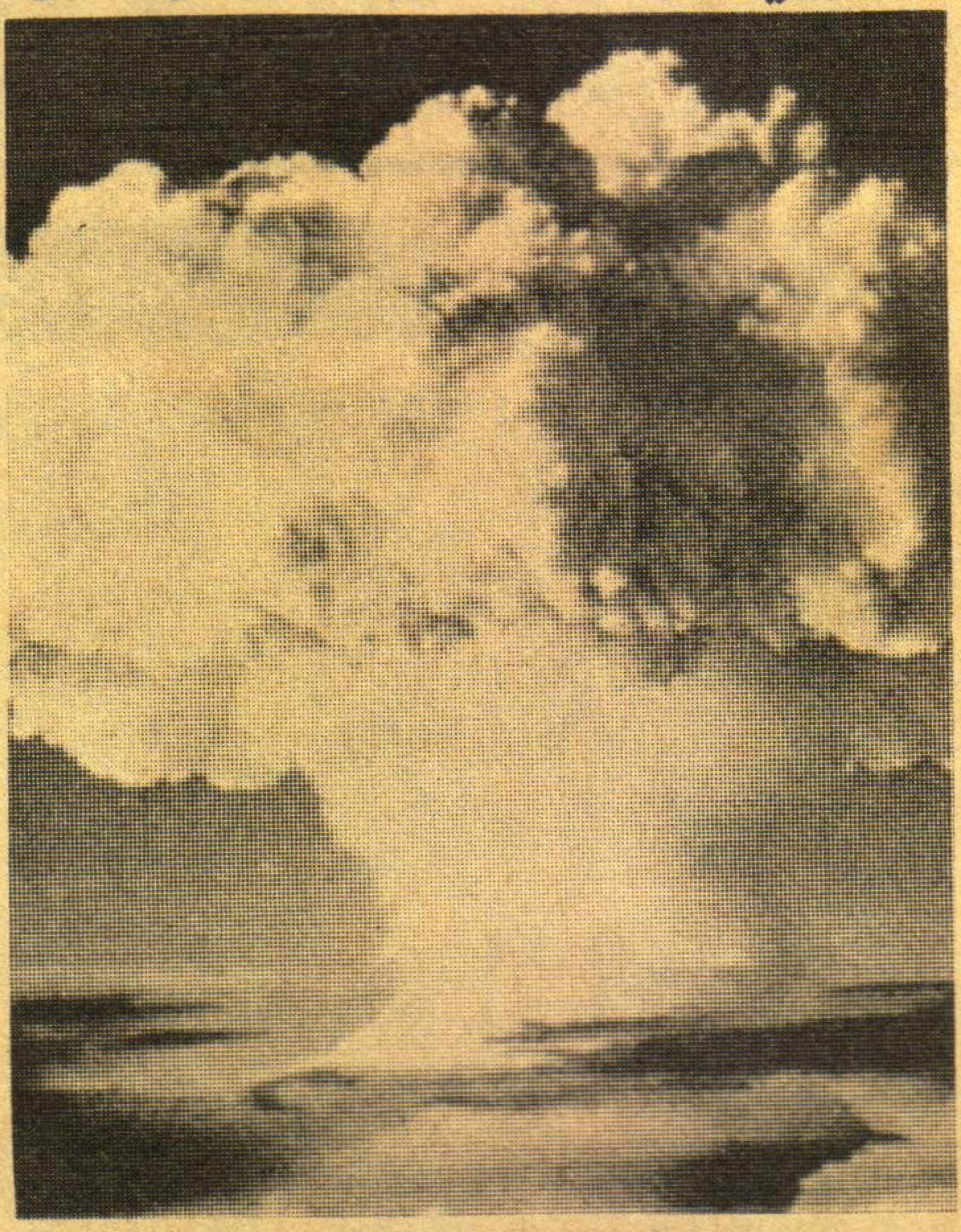
ایٹمی دھماکے کے بعد یہ لے یہاں تک بڑھی کہ ملک بھر میں احیاء پرست تنظیموں نے کچھ اس انداز سے چراغاں کیا جیسے اس دھماکے سے پرانا ویدک ہندوستان دوبارہ جاگ اٹھا ہو جیسے ایٹمی اسلحہ، رامائن اور مہابھارت میں کام آنے والے غیر مرئی ہتھیاروں کا حصہ ہو اور جو لوگ اس وقت دہلی کی سرزمین پر حکومت کررہے ہیں وہ کوئی اور نہیں، انہیں ویدک کرداروں سے ملتے جلتے لوگ ہیں۔ پھر یہ تاثر بھی دینے کی کوشش کی گئی گویا ہزار سالہ غلامی کے بعد نئی حکومت کے نتے دھماکے نے ہندو تہذیب کو دوبارہ اس ملک میں نشاۃ ثانیہ کے عمل سے دوچار کردیا ہے۔ موجودہ حکمرانوں نے اپنے بیانات سے یہ تاثر قائم کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی گویا نیوکلیائی دھماکہ ہندو تہذیب کی قوت کی علامت ہے۔ پوکھران میں شکتی مندر کی تعمیر کی باتیں بھی اسی طرف اشارہ کررہی تھیں۔ مسلمان جو بی جے پی کی موجودہ حکومت سے پہلے سے خائف تھے، انہیں ایسا لگا جیسے ترشول دھاریوں کے ہاتھوں میں اب ایٹم بم آگیا ہو۔ اس حقیقت نے جمہور مسلمانوں کو سخت تشویش میں مبتلا کردیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر مسلمانوں کی طرف سے اس واقعہ پر بہت محتاط رد عمل کا اظہار کیا گیا، زیادہ تر

ایٹمی دھماکے کے بعد یہ لے یہاں تک بڑھی کہ ملک بھر میں احیاء پرست تنظیموں نے کچھ اس انداز سے چراغاں کیا جیسے اس دھماکے سے پرانا ویدک ہندوستان دوبارہ جاگ اٹھا ہو جیسے ایٹمی اسلحہ ، رامائن اور مہابھارت میں کام آنے والے غیر مرئی ہتھیاروں کا حصہ ہو اور جو لوگ اس وقت دہلی کی سرزمین پر حکومت کر رہے ہیں وہ کوئی اور نہیں ،انہیں ویدک کرداروں سے ملتے جلتے لوگ ہیں۔

زبانیں خاموش ہیں۔ زیادہ تر لوگ اس واقعہ پر تبصرہ کرنے سے کتراتے رہے جیسے یہ واقعہ سرے سے پیش ہی نہ آیا ہو۔ مسلمانوں کی مشکل یہ ہے کہ نہ تو وہ شکتی مندر کی تعمیر میں حصہ لے سکتے تھے اور نہ ہی دھماکے کی مخالفت کر کے ملک دشمنی کا الزام اپنے سر لینا چاہتے تھے ۔ حکومت نے پہلی بات تو یہ کی کہ ملک کے ایٹمی تجربے کو ہندو تہذیب کی بیداری سے تعبیر کیا۔ بتایا گیا کہ جو کام دوسری حکومتیں اب تک جذبہ حب الوطنی کی کمی کی وجہ سے نہیں کر پائی تھی وہ اب بی جے پی نے انجام دے دیا ہے ۔ مسلمان جس پر پہلے ہی سے پاکستانی اور ISI ایجنٹ ہونے کا الزام ہے ،جس کی عبادت گاہوں اور تعلیمی اداروں کو ISI کا اڈہ بتایا جاتا ہے ،وہ اس پوزیشن میں نہ تھے کہ اپنے اوپر ملک دشمنی کا کوئی نیا الزام لیتے ۔

ہمارے لیے یہ بات انتہائی تشویش ناک تھی کہ ایک قومی نوعیت کے اہم مسئلہ پر مسلمان خاموش کیوں ہیں ۔ایک ذمہ دار شہری کی حیثیت سے وہ اپنا نقطہ نظر ملک کے سامنے لانے میں کیوں ہچکچا رہے ہیں ۔ اگر وہ کسی وجہ سے خاموش ہیں تو ان کی خاموشی کا سبب کیا ہے ۔ ملی ٹائمز نے اس مسئلے پر مسلمانوں کی رائے جاننے کے لئے ملک کے سات اہم شہروں میں رائے شماری کرائی تاکہ دھماکے کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال پر مسلمانوں کے احساسات کو سمجھا جاسکے ۔ جن شہروں میں ہم نے علامتی سروے کا کام انجام دیا ان کے نام اس طرح ہیں ۔ دہلی ، پٹنہ ،حیدر آباد ، لکھنؤ ، بنگلور ، ممبئی اور بھوپال ۔ اس سروے میں کل بائیس سے چوبیس حضرات و خواتین سے رابطہ کیا گیا اور کوشش کی گئی کہ ہر طبقہ زندگی کے لوگوں تک پہنچا جاسکے ۔

پوچھا گیا کہ کیا آپ کو ایٹمی دھماکہ پر مسرت کا احساس ہوا یا آپ خوفزدہ ہوگئے یا آپ نے محسوس کیا کہ کاش ایسا نہ ہوتا ۔ صرف دو فیصد لوگ ایسے تھے ۔



جنہوں نے خوشی محسوس کی ۔ 76 فیصد لوگوں نے خوف محسوس کیا اور تیرہ فیصد لوگوں کا خیال تھا کہ اے کاش ایسا نہ ہوا ہوتا ۔ البتہ نو فیصد لوگوں نے اس سوال کے جواب سے اعتراض کیا۔

پوچھا گیا کہ کیا دھماکے کے بعد آپ کا سر قومی افتخار سے اونچا ہو گیا یا آپ اپنے ہندوستانی ہونے پر شرمندہ ہوئے یا ایسا لگا کہ آپ کا نہیں ، دراصل ہندو احیاء پرستوں کا سر اونچا کر دیا ہے ۔ صرف چھ فیصد مسلمانوں نے اسے قومی افتخار کی علامت بتایا جب کہ 69 فیصد لوگوں کا یہ احساس تھا کہ اس دھماکے نے ہندو احیاء پرستوں کا مورال بلند کر دیا ہے ۔ سات فیصد لوگوں کو اس واقعے پر شرمندگی کا احساس بھی تھا ۔ اٹھارہ فیصد لوگ کوئی نوٹ کرانے کی پوزیشن میں نہیں تھے ۔

ایک سوال کے جواب میں کہ کیا آپ نے نیوکلیائی دھماکے کی مخالفت میں زبان کیوں نہیں کھولی ۔ 68 فیصد لوگوں کا خیال تھا کہ ان پر ملک دشمن کا الزام عاید کر دیا جاتا ۔ سترہ فیصد لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ان کی مخالفت حالات پر اثر انداز نہیں ہوگی ۔ بارہ فیصد لوگوں نے کسی رد عمل سے احتراز کی وجہ یہ بتائی کہ وہ گومگو کی پوزیشن میں تھے اور یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ مناسب بات کہنے کا وقت کب آتا ہے اور تین فیصد لوگوں نے کسی رد عمل سے احتراز کیا۔

یہ پوچھے جانے پر کہ پاکستان یا کسی دوسرے پڑوسی ملک پر نیوکلیر بم پھینکے جانے پر آپ کا رد عمل کیا ہوگا ، صرف تین فیصد مسلمانوں نے اس عمل کی حمایت کی ۔ 82 فیصد لوگوں نے یہ کہا کہ وہ اس عمل کی مخالفت کریں گے جب کہ پندرہ فیصد لوگوں کا یہ خیال تھا کہ وہ کسی ایسی صورت میں خود کو غیر متعلق رکھنا پسند کریں گے ۔

جب ان لوگوں سے یہ پوچھا گیا کہ کیا ملک کی سلامتی کے لئے نیوکلیائی دھماکہ ضروری تھا تو صرف سات فیصد لوگوں نے اس سے اتفاق کیا ۔ 76 فیصد لوگوں کا خیال تھا کہ دھماکے کے پیچھے ملکی سلامتی بنیادی محرک نہیں تھا جب کہ 37 فیصد لوگوں نے اس سوال کے جواب میں "نہیں معلوم" کہنے میں عافیت جانی ۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ایک سوال کے جواب میں 71 فیصد لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کو زبردست تخفیف کرنا چاہیے ۔

ان جوابات سے جو مجموعی تاثر ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ اولاً ہندوستانی مسلمان جھوٹے الزامات اور زہریلے پروپیگنڈے کے گرداب میں خود کو کچھ اس طرح گھرا پاتے

ہیں کہ وہ اہم قومی مسائل پر اظہار خیال کی ہمت بھی نہیں جٹا پاتے، مبادا ان پر ملک دشمن اور پاکستانی ایجنٹ ہونے کا الزام نہ لگادیا جائے۔ کسی ملک میں اتنی بڑی آبادی ڈر اور خوف کی نفسیات میں بتلا ہوکر اگر اپنے خیالات پر پردہ ڈالنے پر مجبور ہوجائے تو یہ ایک تشویش ناک علامت ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ اس ملک کے مستقبل کے سلسلے میں سوالیہ نشانات پیدا ہوجاتے ہیں بلکہ خود کسی آزاد فضا میں اظہار خیال کی دستوری آزادی کا دعویٰ محض ایک نمائشی عمل بن جاتا ہے۔ مسلمانوں کے اہل فکر حضرات کو اس بات پر بھی توجہ صرف کرنی ہوگی کہ جس ایٹمی دھماکے کو قومی افتخار کی علامت بتایا جاتا ہے، وہ مسلمانوں کے لئے خوف کا باعث کیوں ہے؟ آخر کیا وجہ ہے کہ اس ملک کے برابر کے شہری ہونے کے باوجود مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کو ایسا محسوس ہوا کہ دھماکے سے ان کا سر تو بلند نہیں ہوا البتہ ہندو احیاء پرستوں کا مورال بلند ہوگیا ہے۔ شاید اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہو کہ ذرائع ابلاغ میں نیوکلیر بم کو ہندو بم کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی اور شکتی مندر کے حوالے سے یہ بتایا گیا کہ یہ کامیابی ان لوگوں کے حصے میں آئی ہے جو شکتی مندر کی تہذیب میں یقین رکھتے ہیں۔ اس سروے سے یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ ہندوستانی مسلمانوں کا بنیادی رویہ اظہار امن کا ہے۔ وہ امن اور شانتی میں یقین رکھتے ہیں اس لئے ان کی ایک بڑی تعداد پڑوسی ممالک پر نیوکلیر بم کے استعمال کی حامی نہیں ہے اور ایسا اس لئے بھی کہ ہندوستانی مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کو اپنے دفاعی بجٹ میں تخفیف کرنا چاہئے۔ ہوسکتا ہے کہ امن کی یہ خواہش ان کی امن پسندانہ ذہنیت کا اظہار ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ڈرا سہما آدمی جس کی زندگی پہلے سے بہت سے عذاب میں گھری ہو، نہیں چاہتا کہ ٹکراؤ کا کوئی نیا محاذ قائم ہو اور اس کی زندگی میں مزید مصیبتوں کا اضافہ ہو۔ ▭

مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کو اپنے دفاعی بجٹ میں تخفیف کرنا چاہئے۔ ہوسکتا ہے کہ امن کی یہ خواہش ان کی امن پسندانہ ذہنیت کا اظہار ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ڈرا سہما آدمی جس کی زندگی پہلے سے بہت سے عذاب میں گھری ہو، نہیں چاہتا کہ ٹکراؤ کا کوئی نیا محاذ قائم ہو اور اس کی زندگی میں مزید مصیبتوں کا اضافہ ہو۔

بقیہ: ملک میں خاموشی سے رام مندر کی تعمیر کا کام جاری ہے

ہوجائیں گے۔ آرکٹیکٹ مسٹر سوم پورا کے مطابق جو کام کی رفتار سے مطمئن نہیں ہیں اس پورے کام میں اسی کروڑ روپے تک خرچ ہوسکتے ہیں کیونکہ روایتی دستکاروں سے مندر کے ستونوں پر رامائن کے کرداروں کی شبیہوں کی کندہ کاری کا کام بہت نازک اور قیمتی ہے اور وقت طلب بھی۔



☆ کاریگر مندر میں کام آنے والے ستونوں کی تراش خراش میں مصروف

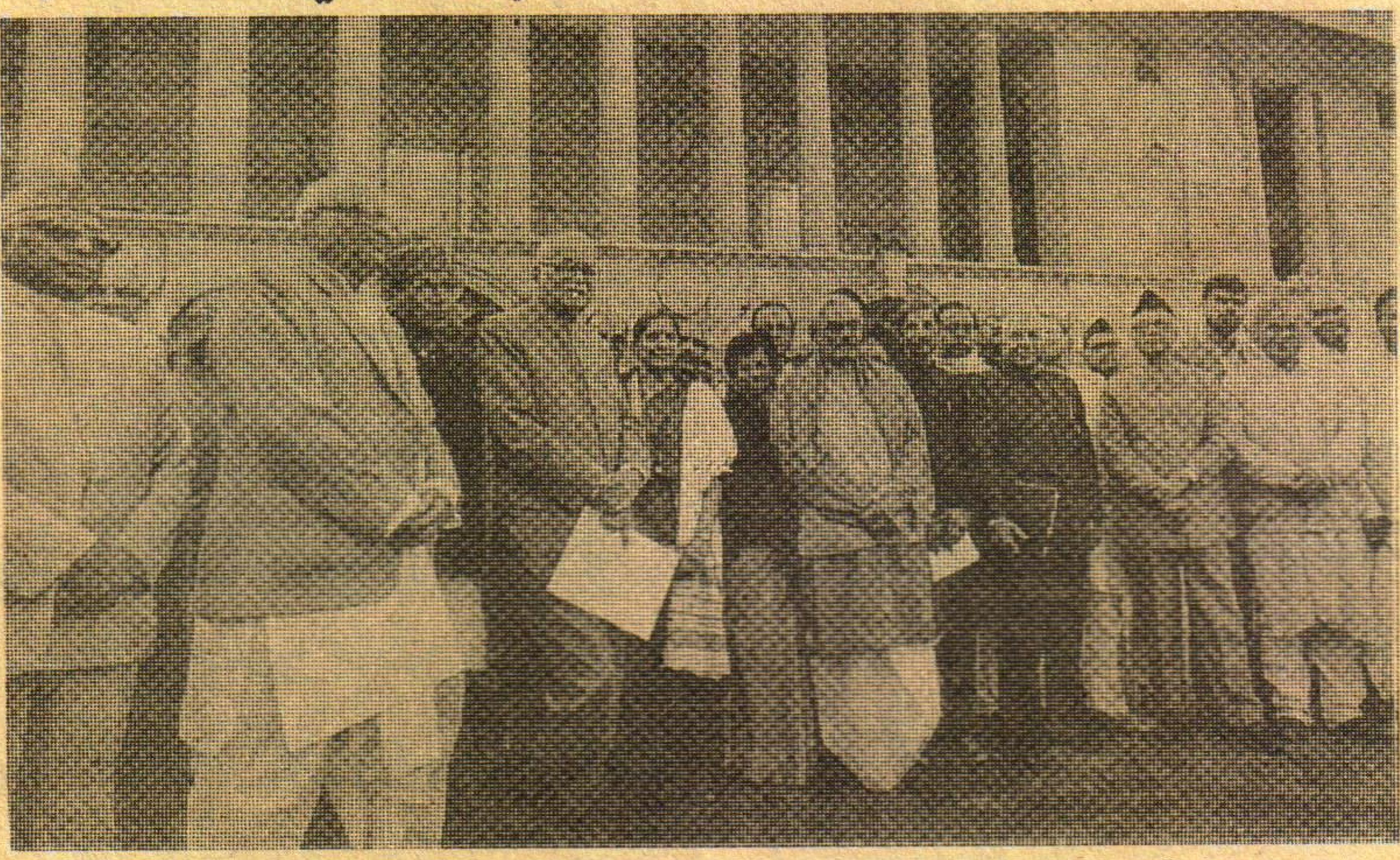
مندر سازی کے سوال پر بی اچ پی کا اختلاف وی اچ پی سے اس نوعیت کا نہیں ہوگا جیسا کہ کاشی اور متھرا کے سلسلے میں تھا کیونکہ اسی کی دہائی میں مندر کی تحریک ہی بی اچ پی کی کامیابی کی ضمانت ثابت ہوئی تھی اور یہ بات اس کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوسکتی۔ بی جے پی اور وی اچ پی کے مشترک مفاد کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ دونوں تنظیموں کے سرکردہ لیڈروں پر بابری مسجد کے انہدام کے الزام میں ملک کی عدالتوں میں مقدمے چل رہے ہیں نیز یہ کہ سنگھ پریوار نے اسی جگہ پر مندر بنانے کے عزم کا بار بار برملا اظہار کیا ہے جہاں پر مسجد شہید کی گئی تھی۔ اسی بات سے اس شبہ کو تقویت ملتی ہے کہ سنگھ پریوار پہلے سے ڈھالی ہوئی سلوں کو جوڑ کر آناً فاناً مندر تعمیر کر کے مسجد کی شہادت کے جیسے عمل کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔

جس طرح بی جے پی پوکھرن میں حالیہ نیوکلیائی دھماکے سے سیاسی فائدہ نہ اٹھانے کی یقین دہانیوں کے باوجود فائدہ اٹھارہی ہے اسی طرح مرکز میں برسر اقتدار آنے کے بعد اپنی غیر فرقہ وارانہ امیج پیش کرنے کے باوجود فرقہ واریت میں گلے گلے ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کے سامنے مسئلہ یہ طے کرنے کا ہے کہ وہ کب تک اپنے پہلے سے تسلیم شدہ مقاصد سے دور رہ کر اقتدار پر جمی رہ سکتی ہے یا یہ کہ بالاخر کامیابی حاصل کرنے کی غرض سے اپنے خفیہ ایجنڈے کو بروئے کار لانے کے لیے اپنے حلیفوں اور مرکز میں اقتدار سے محرومی کا خطرہ مول لے سکتی ہے۔ لیکن اندر سے ایک اور سوال بھی اسے کچوکے لگاتار ہے گا وہ یہ کہ جب مندر بن جائے گا، اس کے بعد کیا ہوگا؟ ▭

دستور پر نظر ثانی کی مخالفت کیوں؟

اب وقت آگیا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے دستور پر اعتراضات وارد کئے جائیں

بھارتی جنتا پارٹی نے دستور ہند پر نظر ثانی کا جو مسئلہ اٹھایا ہے اس سے عام طور پر ہندوستانی مسلمان سخت خائف اور متوحش نظر آتے ہیں۔ مسلمان جو اب تک سخت ترین لمحات میں آئینی اور جمہوری جدوجہد کے ذریعے داد رسی کی امید لگائے رہتے تھے انہیں ایسا لگ رہا ہے جیسے ان کی امیدوں کی آخری "پناہ گاہ" بھی ختم ہوتی جارہی ہے۔ مسلمانوں کو یہ اندیشہ ستائے دیتا ہے کہ اب تک دستور میں موجود جن خوشنما الفاظ کے سہارے وہ مستقبل کا جواب بنتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ آنے والے دنوں میں جب کوئی فرشتہ صفت شخص اس ملک کی باگ ڈور سنبھالے گا تو دستور کے خوشنما الفاظ اچانک حقیقت کا روپ اختیار کرلیں گے اور تب ہماری ساری مصیبتوں کا ازالہ ہوجائے گا۔ موہوم مستقبل طلوع ہونے سے پہلے ہی رخصت ہوا چاہتا ہے۔



مسلمان اب تک اسی حوالے سے آئینی اور جمہوری جدوجہد کے علمبردار کی حیثیت سے خود کو پیش کرتے رہے ہیں۔ ایسا اس لئے بھی کہ عام طور پر باشعور مسلمان بھی یہ سمجھتا رہا ہے کہ اس ملک میں اگر مسلمانوں پر ایام حیات تنگ ہیں اور انہیں ہر لحہ ایک اذیت ناک زندگی کا سامنا ہے تو اس کی وجہ دراصل حکمرانوں کی بدنیتی ہے ورنہ ملک کا آئین تو مسلمانوں کو ایک ایسی جنت میں رکھنا چاہتا ہے جہاں ہر طرف امن ہی امن ہوگا۔ مسلمان گذشتہ پچاس برسوں سے لائق حکمرانوں کے انتظار میں عقوبت کی زندگی جیتے رہے۔ انہیں یہ بتایا گیا تھا کہ حقیقی سیکولرزم کے علمبردار جب اس نظام کو مل جائیں گے تو ایک پرسکون اور خوشحال زندگی کا خواب خود بخود شرمندہ تعبیر ہوجائے گا۔

پچاس سال گزر گئے لیکن اس ملک کو کوئی سیکولر حکمراں میسر نہ آسکا۔ دستور خوشنما الفاظ حقیقت کا روپ تو کیا اختیار کرتے اس کے برعکس ہوا یہ کہ دستوری اور جمہوری عمل کے نتیجے میں وہ لوگ برسر اقتدار آگئے جو اس خوشنما آئینی جنت پر نظر ثانی چاہتے ہیں یعنی مسلمان جس دستور پر اب تک تکیہ لگائے تھے خود وہ دستور اب تبدیلی کی زد میں ہے۔ ایسی صورت میں ان پر وہ کیفیت طاری ہے جو زمین پیروں سے نکلتے وقت ہوتی ہے۔ گویا دستور پر نظر ثانی کا مطالبہ ان کے وجود پر آرے چلانے کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے دستور پر کسی نظر ثانی کی مخالفت کی جارہی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی بھی عجیب مشکل ہے جس نظام کے ہاتھوں انہیں مسلسل پچاس برسوں میں اذیت کا سامنا رہا ہے اسی نظام کے بنیادی آئین کی حفاظت کو اپنا فرض جانتے ہیں حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جس جمہوری، دستوری، سیکولر نظام کے عذاب سے ان پر صبح و شام جہنم طلوع ہوتا رہا ہے اس نظام کے دستور پر نظر ثانی کا مطالبہ سب سے پہلے ان کی طرف سے اٹھایا جاتا اور وہ ملک کے انصاف پسند باشندوں کو اس بات پر قائل کرتے کہ اس جمہوری نظام میں ایک منصفانہ اور پرامن معاشرے کے قیام کا امکان نہیں پایا جاتا لہذا پچاس سالوں کے اذیت ناک تجربوں کے بعد اب وقت آگیا ہے کہ اس بنیادی دستاویز پر نئے سرے سے گفتگو کی جائے جو اس ملک کے پچیس کروڑ مسلمانوں کو پرامن زندگی کی ضمانت دینے میں ناکام رہا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب اس دستاویز پر کسی گوشے سے نظر ثانی کی آواز اٹھی ہے تو مسلمان دستور ہند کی محافظ کی حیثیت سے خود کو پیش کررہے ہیں۔ یقینا جو لوگ نظر ثانی کی بات کررہے ہیں ان کی نیتیں درست نہیں ہیں لیکن کیا ہم بحیثیت مسلمان یہ

پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ دستور ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی عقیدے کا جز نہیں ہے جسے ناقابل تحریف سمجھا جائے یا جس پر نظرثانی کی مخالفت کی جائے۔ پھر یہ کہ اگر ملک میں گذشتہ پچاس برسوں سے ہندوستانی مسلمانوں پر ہر لمحہ ایک نیا جہنم طلوع ہوتا رہا ہے تو اس نظام اور اس کے بنیادی ڈھانچے میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی تو ضرور ہے۔

سمجھتے ہیں کہ دستور ہند ایک ناقابل تحریف دستاویز ہے اور یہ کہ اس کو موجودہ شکل و صورت میں برقرار رکھنا ہی ہمارے ملی مفاد کا تحفظ کر سکتا ہے۔

پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ دستور ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی عقیدے کا جز نہیں ہے جسے ناقابل تحریف سمجھا جائے یا جس پر نظرثانی کی مخالفت کی جائے۔ پھر یہ کہ اگر ملک میں گذشتہ پچاس برسوں سے ہندوستانی مسلمانوں پر ہر لمحہ ایک نیا جہنم طلوع ہوتا رہا ہے تو اس نظام اور اس کے بنیادی ڈھانچے میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی تو ضرور ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کو یہ بھی سوچنا ہوگا کہ کیا مسابقہ اذیت ناک زندگی کو اسی انداز سے جاری رکھنا چاہتے ہیں اور ان ہی بے جان خوشنما الفاظ کے سہارے مستقبل کی زندگی جینا چاہتے ہیں یا وہ ایک نئی صبح کے قیام کے آرزومند ہیں؟ اگر سابقہ دردناک بے بس زندگی سے پیچھا چھڑانا مقصود ہے تو یقیناً ہمیں اس نظام اور اس کے اداروں کا احتساب کرنا ہوگا اور ہمیں اپنے موقف سے دوسرے باشندگان ملک کو باخبر کرنا ہوگا تاکہ ایک نئے عادلانہ نظام کے قیام کے لئے اگر دوسری قوموں میں بھی کوئی آرزو پائی جاتی ہے تو مسلمان اسے ایک صحت مند رخ دے سکیں۔

گذشتہ دنوں کمیونسٹوں کی طرف سے اس اندیشے کا اظہار کیا گیا کہ بی جے پی آئین کے بہانے دراصل دو چیزوں کو دستور سے ختم کرنا چاہتی ہے۔ اولاً سیکولرزم ثانیاً درج فہرست ذاتوں کے لئے ریزرویشن کی سہولت۔ کمیونسٹ پارٹی کو اگر کوئی اعتراض ہے تو ان ہی دو بنیادوں پر۔ اگر یہ اندیشہ صحیح ہے تو ان دو باتوں میں سے کوئی بات ایسی نہیں جسے مسلمان اپنی لڑائی کا ایجنڈا بنائیں۔ اس لئے کہ مسلمان کی حیثیت سے یہ سرے سے ہمارا دردسر نہیں ہے کہ اس ملک میں سیکولرزم رہے یا غارت ہو جائے۔ ہم بشمول سیکولرزم دنیا کے تمام ازم کے مخالف ہیں۔ رہا موجودہ دستوری تحفظات میں درج فہرست ذاتوں کا مسئلہ تو اس کے خاتمے سے مسلمانوں کے صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان ان دو بنیادوں پر دستور ہند پر نظرثانی کی مخالفت کریں۔

اب رہی یہ بات کہ چونکہ حکمرانوں کی نیت صاف نہیں ہے اور وہ دراصل نظرثانی کے ذریعے مسلمانوں سے دستوری تحفظات چھین لینا چاہتے ہیں تو یقیناً یہ ایک تشویشناک مسئلہ ہے لیکن اس کا یہ حل نہیں کہ ہم موجودہ نظام کو جوں کا توں برقرار رکھنے پر اصرار کریں۔ اس وقت مسلمانوں کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ بلی کے ساتھ اونٹ بھی باندھ دیا گیا ہے۔ دستور جہاں بعض تحفظات کی ضمانت دیتا ہے وہیں اس کے اندر بعض ایسی باتیں بھی ہیں جو ایک ملی اسلامی زندگی کا تار و پود بکھیرے دیتی ہیں۔ گویا خواہی نہ خواہی بلی کی طلب میں اونٹ کا بوجھ آپ کی گردن پر آ پڑتا ہے۔ اس لئے یہ بات مسلمانوں کے حق میں نہیں کہ وہ چند خوشنما الفاظ کی خاطر دستور پر نظرثانی کے مطالبے کو ٹھکرا دیں بلکہ انہیں چاہئے کہ وہ اعتماد کے ساتھ پچاس سالہ تجربات کی روشنی میں دستور کی ایک ایک شق کا جائزہ لیں اور اس بارے میں اپنے موقف کو اہل ملک کے سامنے لائیں ورنہ ہوگا یہ کہ وقت آگے بڑھتا جائے گا، تبدیلیاں دبے پاؤں داخل ہو جائیں گی اور تب ہمارا احتجاج کچھ کام نہ آئے گا۔

دستور انسانوں کی مرتب کردہ ایک دستاویز ہے۔ یہ انسانوں کی ایجاد کردہ شریعت ہے اس لئے اسے آسمانی کتابوں جیسا تقدس حاصل نہیں ہو سکتا اور چونکہ انسانی فہم ہر لمحہ ارتقائی مراحل سے دوچار ہے اس لئے انسانوں کے بنائے ہوئے کسی بھی ضابطہ حیات کو حتمی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ خود جن لوگوں نے کوئی پچاس سال پہلے موجودہ دستور کو ترتیب دیا تھا انہیں بھی اس بات کا احساس تھا کہ موجود دستور کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قطعیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ڈاکٹر امبیڈکر نے اس نکتہ کی وضاحت کے لئے امریکی مدبر ٹامس جیفرسن کے دو اقتباسات کا سہارا لیا تھا جو درج ذیل تھے۔

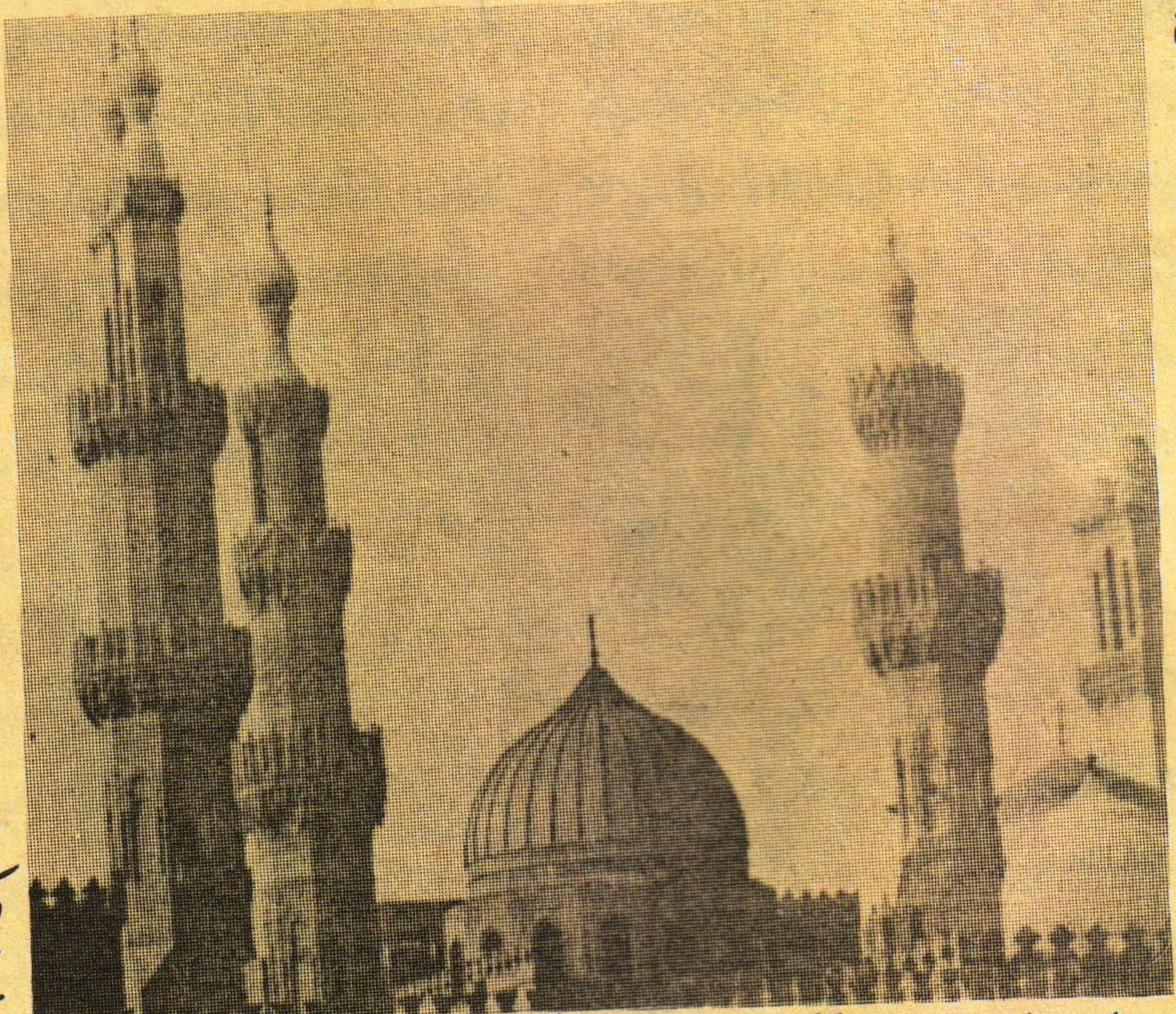
"ہمیں ہر نسل کو ایک منفرد قوم سمجھنا چاہئے اور یہ حق دینا چاہئے کہ وہ اکثریت کی رائے سے اپنے لئے خود پر کچھ پابندیاں نافذ کرے۔ لیکن اسے یہ حق نہیں دیا جانا چاہئے کہ وہ آنے والی نسلوں کو بھی اپنی عائد کردہ پابندیوں کے لئے مقید کر دے اور نہ ہی اسے یہ حق دیا جانا چاہئے کہ وہ دوسرے ملک کے لوگوں پر اپنی رائے تھوپے۔

گویا خود دستور کے مرتبین کو اس بات کا خوب اندازہ تھا کہ وہ نئے ہندوستان کے لئے جو دستور مرتب کر رہے ہیں وہ صرف ایک مخصوص دور کی ضرورت پوری کر سکتا ہے۔ رہے آنے والے ایام تو اس میں یقیناً دستور اپنی موجودہ صورت حال

دستور انسانوں کی مرتب کردہ ایک دستاویز ہے۔ یہ انسانوں کی ایجاد کردہ شریعت ہے اس لئے اسے آسمانی کتابوں جیسا تقدس حاصل نہیں ہو سکتا اور چونکہ انسانی فہم ہر لمحہ ارتقائی مراحل سے دوچار ہے اس لئے انسانوں کے بنائے ہوئے کسی بھی ضابطہ حیات کو حتمی حیثیت نہیں ہو سکتی

میں اہالیان ملک کی ضرورت پوری نہیں کرسکے گا۔ اسی نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے ابمیڈکر نے جیفرسن کے اس اقتباس سے استدلال کیا تھا۔

"یہ خیال کہ جو ادارے کسی قوم کے فائدے کے لئے بنائے گئے ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی، اسے ہاتھ نہیں لگایا جاسکتا خواہ اس سے وہ فوائد حاصل ہورہی ہوں یا نہیں۔ صرف اس لئے کہ کل جن لوگوں نے ان اداروں کو قائم کیا تھا انہیں عوام کا اعتماد حاصل تھا۔ تو یہ بات جابر حکمرانوں سے ان اداروں کی حفاظت کے لئے تو مفید ہوسکتی ہے البتہ کسی قوم کو ان اداروں سے فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن نہ جانے کیوں ہمارے قانونی ماہرین اور مذہبی لوگ عام طور پر یہ عقیدہ بنالیتے ہیں کہ پچھلی نسلوں کو اس زمین پر تصرف کا ہم سے زیادہ اختیار حاصل تھا۔ انہیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہم پر اپنے قوانین تھوپ دیں اور ہمیں ان قوانین میں ترمیم کا حق حاصل بھی نہ ہو اور اسی طرح ہم بھی مستقبل کی نسلوں کے لئے قوانین بنائیں جسے آنے والی نسلیں ناقابل ترمیم سمجھیں۔ پھر تو یہی بات ہوئی کہ اس زمین پر مردوں کی حکمرانی ہے زندوں کی نہیں۔"



ڈاکٹر ابمیڈکر نے کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں بحث کے دوران بہت واضح الفاظ میں جیفرسن کے ان خیالات کی تائید کرتے ہوئے کہا تھا کہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی نے عمداً اس بات سے احتراز کیا ہے کہ موجودہ دستور کو کوئی آخری اور قطعی دستاویز بتائے اور اسے غلطیوں سے یکسر پاک گردانے بلکہ اس کے برعکس ہم نے دستور میں تبدیلی کے لئے انتہائی آسان طریقے کی نشاندہی کی ہے۔

گویا خود دستور کے اندر دستور پر نظرثانی کی ضرورت کا احساس پایا جاتا ہے۔ دستور کی دفعہ 368 میں ترمیم کے طریقے کی وضاحت کی گئی ہے اس لئے فی نفسہ دستور میں تبدیلی یا اس پر نظرثانی کی خواہش کوئی ایسا عمل نہیں جس کی مخالفت کی جائے۔ البتہ جو چیز اس وقت مسلمانوں کو پریشان کررہی ہے وہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے اسلام دشمن عزائم ہیں۔ بی جے پی چاہتی ہے کہ اپنے دور حکومت میں ایک ہندو ہندوستان کے لئے اگر موجودہ صورت حال میں کچھ اور نہ کرسکے تو کم از کم قانونی سفارشات کی ایک بنیاد تو ضرور رکھ دے جس کو بنیاد بناکر آنے والی حکومتیں مستقبل کا ہندو ہندوستان ترتیب دے سکیں۔ یہی وہ خوف ہے جو مسلمانوں کو دستور ہند پر نظرثانی کی مہم کی مخالفت پر مجبور کررہا ہے۔

ہمارے خیال میں وقت آگیا ہے کہ مسلمان دستور ہند کا اپنے نقطہ نظر سے جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ دستور میں کون کون سی باتیں ان کے مذہبی عقیدے سے ٹکراتی ہیں اور کن کن باتوں سے انہیں گذشتہ پچاس برسوں میں تکلیف پہنچتی رہی ہے۔ اگر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر سے دستور میں بعض بنیادی ترمیم کی ضرورت ناگزیر ہے تو انہیں چاہئے کہ اہل ملک کے سامنے اپنے اعتراضات کو رکھیں اور واضح طور پر بتائیں کہ دستور کی فلاں فلاں شق ان کی ملی زندگی کے تار و پود بکھیرتی رہی ہے۔ مثال کے طور پر دستور کی دفعہ 44 ریاستی پالیسی کے جو رہنما اصول متعین کرتی ہے اس میں وضاحت کے ساتھ ایک ایسے معاشرے کے قیام کی تلقین ملتی ہے جسے یونیفارم سول کوڈ کا معاشرہ کہا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن کا مطالبہ ہے کہ اس ملک کے کارواں کو قرآنی سول کوڈ کے راستے پر گامزن کردیا جائے۔ گویا قرآن اگر ایک طرف لے جانا چاہتا ہے تو دستور بالکل دوسری سمت ہندوستانی مسلمان پچھلے پچاس برسوں سے اس مخمصے کا شکار رہے ہیں کہ وہ کریں تو کیا کریں؟ قرآن کی ہدایات کو یکسر فراموش کرنا ان کے لئے ممکن نہیں اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ ایک غیر قرآنی سمت میں شرح صدر کے ساتھ سفر جاری رکھ سکیں۔ مسلمان کی حیثیت سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن ناقابل تنسیخ ہے اس پر نظرثانی نہیں ہوسکتی۔ اگر دستور اور قرآن میں کوئی ٹکراؤ پایا جاتا ہے تو دستور پر نظرثانی کے ذریعے اس ٹکراؤ کو ختم کرنا ہوگا جب ہی ہندوستانی مسلمان اس ملک کے مکمل نظریاتی شہری ہوسکیں گے۔ اب چونکہ خود حکومت کی طرف سے دستور پر نظرثانی کا مطالبہ سامنے آیا ہے اور بعض لوگ سنجیدگی کے ساتھ سفارشات مرتب کرنے میں مشغول ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو چاہئے کہ ان کے یہاں بھی اہل فکر حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی دستور کا از سر نو جائزہ لے اور ایک ایسے نئے دستور کا مسودہ پیش کرے جس میں عدل کا وافر امکان پایا جاتا ہو اور جو نظری بنیادوں پر مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہو۔ ☐

ملک میں خطرناک تبدیلیوں کا آغاز ہوچکا ہے

قرائن بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کو سرنگ کے دوسری طرف روشنی نظر نہیں آرہی ہے

گذشتہ دنوں درگاہ اجمیر شریف سے جبہ و دستار والے مسلمانوں کے ایک وفد نے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی کو نئی دہلی میں ایک یادگاری تحفہ پیش کیا۔ نیک تمناؤں کے تبادلے ہوئے اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر واجپئی جی کی سلامتی اور ان کے اقبال کے لئے خوب خوب دعا کی گئی۔ (ریکارڈ کے لئے ہم نے یہ تصویر اس صفحے پر شائع کردی ہے) اس طرح گویا بھاجپائی حکومت کی طرف ہندوستانی مسلمانوں کے رویے کا ایک اعلان عام ہوگیا۔ مرکز میں بھاجپائی حکومت کے قیام کے بعد کچھ دنوں تک تو بڑے احتیاط کا مظاہرہ کیا گیا لیکن رفتہ رفتہ عام مسلمانوں کو ایسا لگا کہ اس ملک میں زندہ رہنے کے لئے انہیں نئے حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری ہوگی۔

پھر جو لوگ کانگریس اور جنتادل کے زوال کے بعد سرپرستی سے محروم ہوگئے تھے ان کے لئے بھی اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ نئے حکمرانوں سے راہ و رسم پیدا کریں۔



☆ اجمیر شریف سے ایک وفد وزیر اعظم مسٹر اٹل بہاری باجپئی کے لئے مصروف دعا

ہندوستانی مسلمانوں کی بھی عجب مشکل ہے۔ کفر کے اتھاہ سمندر میں انہیں اپنے لئے راستہ بنانا دشوار ہورہا ہے۔ انہیں اس بات کا تو احساس ہے کہ نئی حکومت بہت تیزی کے ساتھ ان کے اعصاب پر حملے کررہی ہے لیکن وہ اس نئی صورت حال میں کسی انقلابی راستے کو اختیار کرنے کے بجائے ان ہی پرانی ترکیبوں سے کام چلانا چاہتے ہیں جن کے ازکار رفتہ ہونے کا انہیں پورا پورا یقین ہے۔ اترپردیش میں وندے ماترم کے حوالے سے جو نئی صورت حال پیدا ہوئی ہے وہاں بھی مسلمانوں کی طرف سے کوئی مؤثر قدم اٹھانے کے بجائے صرف تجاویز اور قرارداد پر اکتفا کیا گیا ہے۔ دینی تعلیمی کونسل نے وزیر اعلیٰ یوپی سے تحریری طور پر درخواست کی ہے کہ مسلمانوں پر زبردستی ہندو ثقافت کو نہ تھوپا جائے۔ گویا جن لوگوں نے ہم پر یہ ناقابل برداشت صورت حال تھوپی ہے ہم ان سے ہی یہ توقع کئے بیٹھے ہیں کہ وہ اس صورت حال کو بدل ڈالیں گے۔ گو کہ تحریری طور پر وزیر اعلیٰ نے یہ یقین دلایا ہے کہ مسلمانوں کے حوالے سے متعلقہ محکموں کو یہ ہدایت جاری کردی گئی ہیں لیکن یہ سب زبانی باتیں ہیں۔ یوپی کے سرکاری تعلیمی اداروں سے مستقل ہندو بھجن اور وندے ماترم کی آوازیں آرہی ہیں۔ عجب نہیں کہ آنے والے دنوں میں حکومت اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرے اور کچھ لے دے کر معاملہ اختتام کو پہنچے۔ البتہ حکومت کی یہ خواہش ضرور ہوگی کہ وہ مسلم قائدین سے اس کے عوض بھاجپا کے لئے وفاداری کا مطالبہ کرے۔ دیکھا جائے تو یہ وہی تکنیک ہے جس پر گذشتہ پچاس برسوں سے کانگریس کی مختلف حکومتیں عمل کرتی رہی ہیں۔ یعنی سب سے پہلے تو مسلمانوں کے لئے ایک مسئلہ پیدا کیا جائے اور پھر مسلمانوں کی طرف سے اگر بار بار اس مسئلے کے حل کے لئے اصرار بڑھے تو اس کو جزوی طور پر حل کرکے مسلمانوں کی ہمدردیاں خرید لی جائیں اور انہیں اس بات کا یقین دلایا جائے کہ وہ پوری طرح حکومت کے رحم و کرم پر ہیں۔ ان کا جینا اور مرنا غیر مسلم حکمرانوں کے ہاتھ میں ہے اس لئے وہ اگر اپنی خیر چاہتے ہیں تو ہماری حکومت کے وفادار خادم بن کر رہیں۔ اپنا ووٹ ہمارے لئے وقف کردیں اور ہر الیکشن میں اپنی ساری توانائیاں ہماری حمایت میں صرف کرتے رہیں۔ کانگریس کے بعد اب بی جے پی بھی مسلمانوں کو اپنا وفادار خادم بنانا چاہتی ہے۔

مسلمانوں کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ ان کے پاس ایسی کوئی قیادت نہیں جو انہیں قرارداد اور بھیک کی سیاست سے نجات دلاسکے۔ انہیں خوب معلوم ہے کہ حکمراں ان کی جان کے درپے ہیں۔ ان سے ان کا تشخص چھین لینا چاہتے ہیں لیکن وہ اپنے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں پاتے کہ وہ ان ہی حکمرانوں سے اپنے

تشخص کی ضمانت کا مطالبہ کریں۔ یہ ایک ایسا شیطانی دائرہ ہے جس میں ہندوستانی مسلمان مسلسل پچاس برسوں سے گھوم رہے ہیں۔ وہی مسلم شناخت پر حملہ، مسائل کے پیدا کرنے کا وہی انداز اور اس کے حل کے لئے علماء و قائدین کے وہی جلسے، وہی گھن گرج، وہی انداز، وہی قرارداد اور وہی درخواست، حکمرانوں کی خدمت میں پیشی کا وہی انداز، عرض گزاری کا وہی ملتجیانہ رویہ، جی حضوری کی وہی کیفیت اور ان مسائل کے کسی قدر حل ہوتے ہی خادمین امت کا وہی مست خرام۔ پچھلے پچاس سالوں سے اس ملک میں یہی سب کچھ ہوتا رہا ہے۔ کانگریس کی حکومت بھی ایسے مسلمانوں کی تلاش میں رہتی تھی جو مسلمانوں کے مسائل اس کی خدمت میں پیش کر سکیں اور اب بی جے پی بھی مسلمانوں کو دعوت دے رہی ہے کہ وہ ہمارے ہی پیدا کردہ مسائل لے کر ہمارے سامنے آئیں۔ ہم اسے حل کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ کانگریس ہو یا بی جے پی یا حکمرانی کے منصب پر کسی اور کافر حکمراں کا ظہور کیوں نہ ہو؟ یہ سب کے سب ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے رحم و کرم پر رکھنا چاہتے ہیں۔ ان سبھوں کی یہ کوشش ہے کہ اس ملک میں مسلمان ایک ایسی بے جان اقلیت کی حیثیت سے زندہ رہنے پر آمادہ ہو جائیں جن سے حکمرانوں کو کبھی کوئی خطرہ نہ ہو اور ان کا کام صرف یہ ہو کہ وہ ذلیل زندگی کے حصول کے لئے کافر و مشرک آقاؤں کے دروں پر کاسہ گدائی لئے اپنے تحفظ کی صدا لگاتے رہیں۔

البتہ کانگریس اور بی جے پی میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ مؤخر الذکر اسلام دشمنوں کا ایک منظم گروہ ہے۔ ملک بھر میں اس کے پاس تربیت یافتہ کارکنوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو ہر لحہ اسلام اور مسلمانوں کو اس ملک سے مٹانے کے لئے سرگرم عمل ہیں اس لئے اس بات کا امکان اب بہت زیادہ بڑھ گیا ہے کہ جو کام کانگریس اپنے پچاس سالہ دور حکومت میں سست رفتاری سے کرتی رہی ہے وہ اب بی جے پی کے دور حکومت میں انتہائی تیزی کے ساتھ انجام پا جائے گا۔ ایسا اس لئے بھی کہ کانگریس کی مسلسل پچاس سالہ نوازشوں نے مسلمانوں کو اس قدر کمزور کر دیا ہے کہ اب ان کے حوصلے کسی بڑی مزاحمت کے لئے ناکافی پڑ رہے ہیں۔ ایسی حالت میں بی جے پی کی طرف سے اب جو تیز رفتار کارروائی کی جا رہی ہے اس میں

ان کا جینا اور مرنا غیر مسلم حکمرانوں کے ہاتھ میں ہے اس لئے وہ اگر اپنی خیر چاہتے ہیں تو ہماری حکومت کے وفادار خادم بن کر رہیں۔ اپنا ووٹ ہمارے لئے وقف کر دیں اور ہر الیکشن میں اپنی ساری توانائیاں ہماری حمایت میں صرف کرتے رہیں۔ کانگریس کے بعد اب بی جے پی بھی مسلمانوں کو اپنا وفادار خادم بنانا چاہتی ہے۔

اسلام دشمنوں کی کامیابی کے امکانات پہلے سے کہیں زیادہ روشن ہو گئے ہیں۔ گویا ہندوستانی مسلمان اس وقت تاریخ کے ایک ایسے نازک موڑ پر کھڑے ہیں جہاں تند اور تیز مخالف ہوا ان کے چراغ ملی کو اب بجھایا ہی چاہتی ہے۔ اب منت سماجت کا رویہ اور عرض گزاری کا کوئی انداز ہمارے ملی وجود کی ضمانت کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔

یہ بات نظر انداز نہیں کی جانی چاہئے کہ آج جو لوگ دہلی کی حکومت پر قابض ہیں وہ بظاہر مسلمانوں کے لئے خیر سگالی کی جتنی ہی دلسوز گفتگو کیوں نہ کریں واقعہ یہ ہے کہ وہ دلی کے تخت پر صرف اس لئے وارد ہوئے ہیں کہ اس ملک سے اسلام اور مسلمانوں کے آثار بزور بازو مٹا سکیں۔ ان عزائم کا اظہار وہ اس وقت بھی کر رہے تھے جب وہ حکومت سے دور تھے اور اب بھی جب حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں آگئی ہے وہ اپنے عزائم کا اعلان کر رہے ہیں۔ لوک سبھا میں اڈوانی جی نے آر ایس ایس کے دفاع میں جو کچھ کہا ہے اس سے بھی اس بات کا عندیہ ملتا ہے کہ بی جے پی نے ہندی، ہندو اور ہندوستان کے پرانے خواب کو ترک نہیں کیا ہے بلکہ اڈوانی جی نے یہاں تک کہا کہ انہوں نے حب الوطنی اور وطن پرستی کی تربیت آر ایس ایس میں حاصل کی ہے اور یہ کہ وہ حکومت کے امور کو چلانے کے لئے آر ایس ایس کے مشورے کو قابل اعتراض عمل نہیں سمجھتے۔ اڈوانی ہوں یا واجپئی، جوشی ہوں یا بی جے پی کے دوسرے اہم ستون۔ واقعہ یہ ہے کہ ان سبھوں کی تربیت آر ایس ایس کی گود میں ہوئی ہے اس لئے یہ بات عین فطری ہے کہ یہ حضرات اب اس ملک میں آر ایس ایس کے خواب کو سچ کر دکھانے کے لئے ریاستی اثر و رسوخ کو استعمال کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ آر ایس ایس کے نزدیک اس ملک میں مسلم مسئلے سے نمٹنے کا ایک ہی طریقہ ہے جو بہت حد تک نازی جرمنی میں یہودیوں سے نمٹنے کے طریقے سے ملتا جلتا ہے۔ آر ایس ایس کے گرو گولوالکر نے اپنی بدنام زمانہ تصنیف (We, Our Nationhood Defined) مطبوعہ ۱۹۳۹ میں اس امر پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

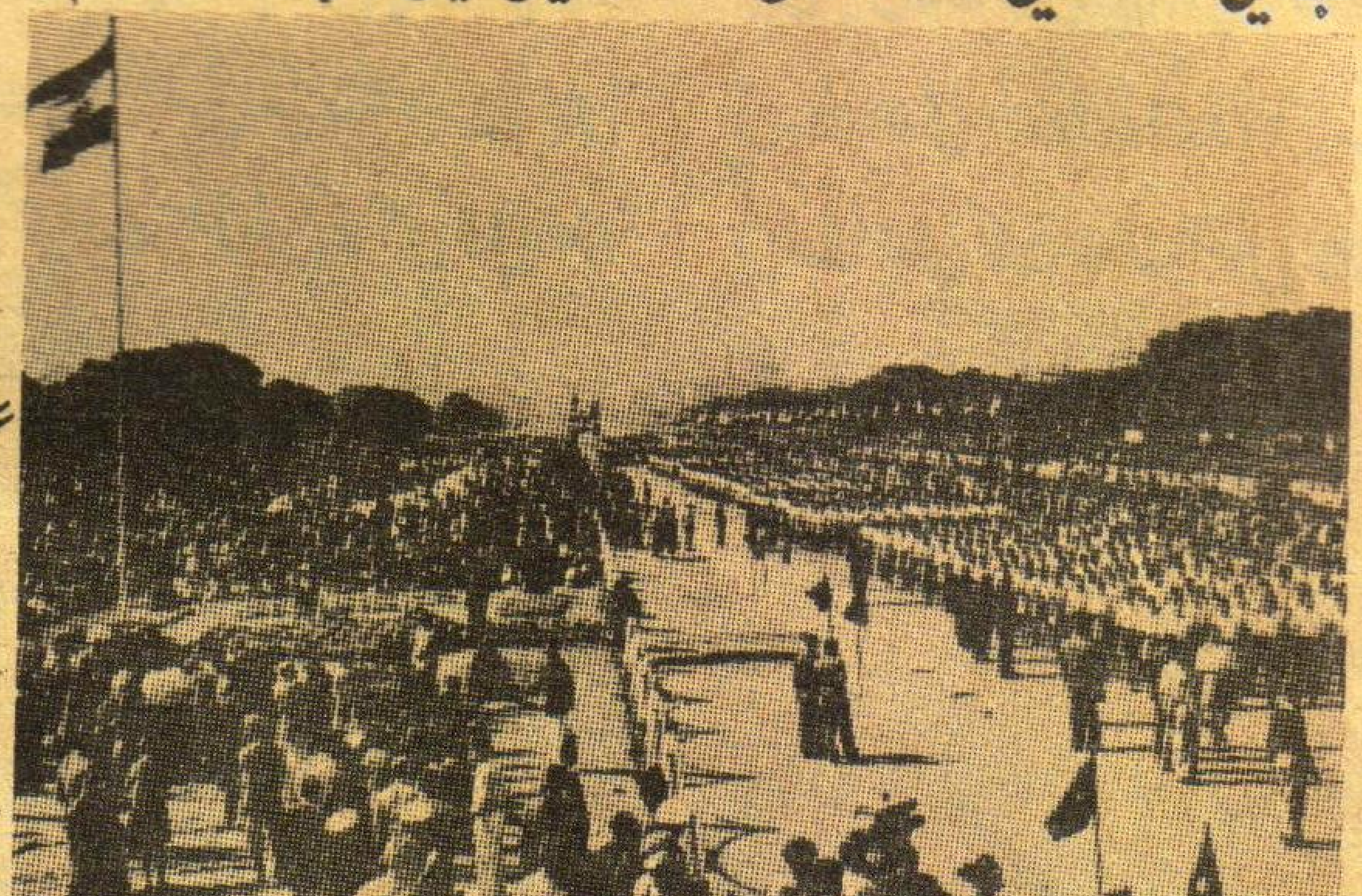
"ہندوستان میں صرف قدیم ہندو قوم کو باقی رہنا چاہئے۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں صرف ہندو قوم۔۔۔ جب تک مسلمان یا دوسرے غیر ہندو اپنی مذہبی، ثقافتی اور سماجی شناخت پر اصرار کریں جب تک انہیں غیر ملکی سمجھا جائے گا۔۔۔ غیر ملکیوں کے لئے اب صرف دو ہی راہ ہے یا تو وہ مقامی لوگوں میں گھل مل جائیں اور ان کی ثقافت اختیار کر لیں یا پھر ان کی خوشنودی اور رحم و کرم پر زندہ رہیں۔۔۔ ہندوستان کی غیر ہندو اقوام پر لازم ہے کہ وہ ہندو ثقافت اختیار کریں۔ ہندو مذہب کو متبرک اور مقدس جانیں۔۔۔ بالفاظ دیگر وہ اپنی غیر ملکیت کو خیرباد کہہ دیں یا پھر خود کو ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔ نہ کوئی مطالبہ کریں اور نہ ہی کسی خصوصی

حیثیت پر اصرار حتی کہ شہری حقوق بھی انہیں نہیں ملنی چاہئیں۔۔۔۔اس ملک میں صرف ہندو قوم بستی ہے۔ مسلمان اور دوسری قومیں اگر دیش مخالف نہیں تو کم از کم دائرہ دیش بھگتی سے باہر تو ہیں ہی۔

گول والکر جو آر ایس ایس اور اس کی تمام ذیلی تنظیموں کے سب سے محترم گرو کی حیثیت رکھتے ہیں وہ اپنی تحریروں میں اور تقریروں میں بار بار مسلمانوں کو دشمن سے تعبیر کرتے ہیں۔ آر ایس ایس ایک ایسے ہندوستان کی تعمیر کے لئے کوشاں رہی ہے جس میں صرف ایک قوم بسے گی، ایک زبان بولی جائے گی اور ایک دھرم کے ماننے والے باقی رہ جائیں گے۔ رہے مسلمان تو ان کا علاج وہی ہے جو ہٹلر نے یہودیوں کا جرمنی میں کیا تھا۔

دہلی میں بھاجپائی حکومت کے قیام کے بعد آر ایس ایس کی قیادت مسلمانوں کو یہ مشورہ بھی دیتی رہی ہے کہ وہ چونکہ نسلی طور پر کبھی ہندو سماج کا حصہ رہے تھے اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ دوبارہ ہندو مذہب میں لوٹ آئیں۔ گذشتہ دنوں اندور میں ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے آر ایس ایس کے موجودہ سربراہ راجندر سنگھ نے یہ بات کہی کہ ہم نے انگریزوں کے آثار کو تو اس ملک سے مٹا دیا لیکن مغلوں کے آثار اس ملک میں ہر طرف پھیلے پڑے ہیں، انہیں ہر قیمت پر ختم کیا جانا چاہئے۔ انہوں نے کاشی، متھرا اور ایودھیا میں ہندوؤں کے مقدسات کی تعمیر پر زور دیا اور مسلمانوں کو یہ مشورہ بھی دے ڈالا کہ وہ مسلمان حکمرانوں کے لئے اپنے دل میں احترام کا کوئی جذبہ نہ رکھیں۔

یہ بات ہر کسی پر عیاں ہے کہ بی جے پی تنظیمی اعتبار سے آر ایس ایس کی سیاسی شاخ ہے اور یہ کہ بی جے پی کے موجودہ قائدین آر ایس ایس کے تربیت یافتہ معتمد کارکن ہیں جن کی تربیت ایام شباب سے آر ایس ایس کی گود میں ہوئی ہے۔ البتہ اگر آر ایس ایس کی طرح وہ مسلمانوں کے لئے براہ براست زہر افشانی سے گریز کر رہے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حکمرانوں کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں ورنہ جہاں تک آر ایس ایس کے خواب کو سچ کر دکھانے کی بات ہے تو اس کے لئے بی جے پی کی حکومت، پارٹی کے کارکنان اور ملک بھر میں پھیلے ہوئے آر ایس ایس کی ذیلی تنظیموں کے منظم کارکنان ہر لحہ سرگرم عمل ہیں اس لئے کسی کو یہ توقع نہیں ہونی چاہئے کہ بی جے پی اقتدار کا مزہ چکھنے کے بعد اب مسلمانوں کی طرف خیرسگالی کا ہاتھ بڑھا رہی ہے گو کہ موجودہ حکومت کی ترجیحات میں یکساں سول کوڈ کا مسئلہ سرے سے خارج از بحث ہے لیکن بی جے پی کی طرف سے وقتاً فوقتاً یکساں سول کوڈ کی حمایت میں بیانات آتے رہے ہیں۔ پھر یہ بات بھی نظرانداز نہیں کی جانی چاہئے کہ دہلی کی حکومت بی جے پی نے جیتا ہے لیکن یہ کامیابی اسی وقت ممکن ہوئی ہے جب آر ایس ایس کے منظم کارکنان نے ملک بھر میں بی جے پی کو اپنی حمایت دی ہے اس لئے یہ بات فطری ہے کہ حکومت کے لئے پالیسی سازی کا کام آر ایس ایس کے مشورے کے بغیر انجام نہیں پاسکے گا۔ پچھلے دنوں لوک سبھا میں اعتماد کے ووٹ کے بحث کے دوران جب ایک گروپ نے پارلیمنٹ میں واجپئی اور اڈوانی سے گول والکر کی مذکورہ تصنیف کے بارے میں پوچھا اور اقلیتوں سے نمٹنے کے لئے گول والکر کے فاشسٹ رویے کی نشاندہی کی تو اڈوانی صاحب نے صرف یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ وہ کتاب مدت سے نایاب ہے اور یہ کہ مصنف نے اپنے خیالات تبدیل کر لئے تھے۔ یہ تو کہنے کی باتیں ہیں لیکن آج تک آر ایس ایس کے کسی بھی قابل ذکر رہنما نے گول والکر کے ان انتہا پسندانہ خیالات کی تردید کی ہمت نہیں کی اس لئے کہ آر ایس ایس کا پورا فلسفہ مسلم دشمنی سے قوت حاصل کرتا ہے۔ ہندی، ہندو، ہندوستان کا خواب اسی وقت پایہ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے جب اس ملک سے مسلمانوں کا مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حل کر دیا جائے اور ایسا گول والکر کے نزدیک دو ہی صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ اولاً یا تو مسلمان دوبارہ خود کو ہندو ثقافت میں ضم کر دیں۔ ثانیاً یا پھر خود کو ہندوؤں کی خوشنودی اور ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔



بی جے پی اسی عمل کو ثقافتی قوم پرستی سے تعبیر کرتی ہے اس لئے کسی کو ایک لمحے کے لئے بھی یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ آر ایس ایس کے تربیت یافتہ کارکنان حکومت پاکر اب اس ملک میں اپنے ان عزائم سے دست بردار ہو جائیں گے جن کے حصول کے لئے انہوں نے حکومت حاصل کی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ہر لحہ مسلسل خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے۔ اجمیر شریف کے وفد کا واجپئی جی کو نیک تمنائیں پیش کرنا یا مسلمانوں کی طرف سے کلیان سنگھ کی خدمت میں وندے ماترم کے عذاب سے بچالینے کی التجا ہو یہ دراصل اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ مسلمان احیاء پرستوں کے رحم و کرم اور ان کی خوشنودی کے ذریعے اس ملک میں زندہ رہنے پر آمادہ ہو گیا ہے جو یقیناً ایک تشویشناک صورت حال ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم فریاد و التجا کا رویہ ترک کر کے ایسے انقلابی رویوں کی بنیاد ڈالیں جس سے آنے والے دنوں میں التجا و فریاد کے شیطانی چکر سے نجات مل سکے ورنہ اندیشہ ہے کہ آنے والے دنوں میں ہندوستانی مسلمانوں پر سیاسی بے بسی اور اذیت ناک محرومی کے سائے مزید گہرے ہوتے جائیں۔ ▭

ملک میں خاموشی سے رام مندر کی تعمیر کا کام جاری ہے

ایودھیا سے ایک انتہائی تشویش ناک رپورٹ

بی جے پی اور اس کے حلیفوں کی نگاہیں ایک ایک پل رام مندر پر لگی ہوئی ہیں کیونکہ مندر کے مسئلے میں وجود کی کشمکش کو بھڑکانے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ اقتدار کے ساجھے داروں خصوصا سمتا پارٹی اور اے آئی اے ڈی ایم کے نے بی جے پی کو اپنے اعلانیہ حکومتی منشور میں مندر کے مسئلہ کو شامل نہ کرنے پر راضی کر کے یہ تاثر دیا تھا کہ وہ بی جے پی کے ہندتو کے منشور سے دست بردار ہو چکے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مندر کی تعمیر کا منصوبہ اندر ہی اندر تیزی سے پایہ تکمیل کو پہنچتا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس منصوبے کے سرپرستوں کی طرف سے حتمی طور پر اس کی تکمیل کی تاریخ کا اعلان نہیں کیا گیا ہے۔ دراصل اس منصوبے کو آگے بڑھانے کا کام نہ کبھی کانگریس کے دور حکومت میں رکا اور نہ ہی متحدہ محاذ اور بی جے پی کے دور اقتدار میں۔ جو کچھ ہوتا رہا وہ سب کے علم میں تھا اور کسی نے اس پر کوئی قید و بند لگانے کی کوشش نہ کی۔



☆ ایودھیا میں وہ جگہ جہاں سے رام مندر کی تعمیر کا منصوبہ انجام پا رہا ہے

حال ہی میں اخباری رپورٹوں سے بعض ایسے حقائق کا انکشاف ہوا ہے جن سے مسٹر اٹل بہاری باجپئی کی مزعوم عدم فرقہ واریت اور حریت پسندی کا پردہ فاش ہو گیا ہے۔ رپورٹوں میں کہا گیا ہے کہ مندر کے ڈھانچے کی تعمیر تین سال سے راجستھان کے سنگ تراشی کی تین سو فیکٹریوں پر مشتمل سروہی ضلع میں واقع تین گاؤں پنڈرارا، کوجرا اور اجاری میں چلتا رہا ہے اور مرکز میں بی جے پی برسر اقتدار آنے کے بعد سے اس کی رفتار تیز ہوتی رہی ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنگھ خاندان کو بابائے قوم کہلانے والے ایم کے گاندھی کے دیگر اقوال کا پاس ہو یا نہ ہو لیکن ان کے اس قول پر انہوں نے عمل ضرور کیا ہے کہ "جو کرنا ہے اسے کر کے رہنا ہے" سنگھ پریوار کی شہ رگ وشو ہندو پریشد کے سربراہ اشوک سنگھل 26 جنوری 1996 کو اس کام کا افتتاح کرنے کے بعد سے مذکورہ ضلع کا دو بار دورہ کر چکے ہیں۔ مندر کا ڈھانچہ جو ڈھلی ڈھلائی سلوں کو جوڑ کر تعمیر کیا جائے گا ان کی تیاری میں گلابی شیڈ اسٹون استعمال میں لایا جا رہا ہے نہ کہ وہ سرخ اینٹیں جو کبھی سنگھ پریوار نے "قوم کی تہذیب سازی" میں عوام کو شریک کرنے کے مقصد سے گاؤں گاؤں گھوم کر اکٹھا کی تھیں۔ یہ سارا کام ایک گجراتی ماہر تعمیر سی بی سوم پورا کے تیار کردہ ڈیزائن کے خطوط پر ہو رہا ہے جنہوں نے ایودھیا میں بنائے جانے والے 128 فٹ اونچے، 268 فٹ لمبے اور 140 فٹ چوڑے مندر کا تصور پیش کیا ہے۔

سروہی میں تراشی گئی سلیں چار ٹرانسپورٹ کمپنیوں کی مدد سے ایودھیا سے دو کلومیٹر کی دوری پر کارسیوک پورم کے مقام پر بنی ورکشاپ میں جمع کی جا رہی ہیں جب کہ پوری طرح تیار مال روم گھاٹ چوراہے پر لا کر اسٹور کیا جاتا ہے۔ مرکز کے علاوہ راجستھان اور اتر پردیش میں بھی برسر اقتدار بی جے پی اب کسی طور پر وی ایچ پی کے جھنڈے تلے چلنے والی سرگرمیوں سے اپنی وابستگی پر پردہ نہیں ڈال سکتی اور اب یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ ہندتوا ایجنڈے کے فروغ میں اس کی دلی خواہشات کار فرما ہیں۔ بی جے پی سنگھ پریوار کی سیاسی تنظیم کی حیثیت سے بنیادی حقائق کو جانچنے پرکھنے کے بعد ہی ہندتوا ایجنڈے کی فصل کاٹنے کے لیے منظر عام پر آئے گی۔

مجوزہ مندر میں دو سو ستون لگائے جائیں گے اور 18 فٹ کے دس ستون بنانے میں تیس ٹرک شیڈ اسٹون کا خرچ ہے اس خام مال کی قیمت کے علاوہ ایک ستون کی تیاری پر تقریبا تین لاکھ کا صرفہ آنے والا ہے۔ اس حساب سے اگر دیکھا جائے تو مندر بنتے بناتے چالیس کروڑ روپے خرچ

باقی صفحہ ۸ پر

اگر نیوکلیائی جنگ چھڑ گئی تو

ہندوستان اور پاکستان دونوں صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گے

نیوکلیائی ہتھیاروں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرنے کی آرزو نئی دہلی اور اسلام آباد دونوں طرف کے حکمرانوں کے دلوں میں مچل رہی ہے لیکن اس کے عواقب سے حکومتیں بھی غافل ہیں اور عوام بھی بے خبر۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ کل جو آندھی آئے گی سب کچھ اڑا لے جائے گی اور یہ ویسا ہی تباہی کا دن ہوگا جس کے لیے قرآن کا ارشاد ہے " یوم یکون الناس کالفراش المبثوث ویکون الجبال کالعہن المنفوش " یہ ہے اس "جنت" کی تصویر جو ہند اور پاکستان کے ارباب اقتدار تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ پیش ہے ولسن جان کی ایک چشم کشا تحریر۔

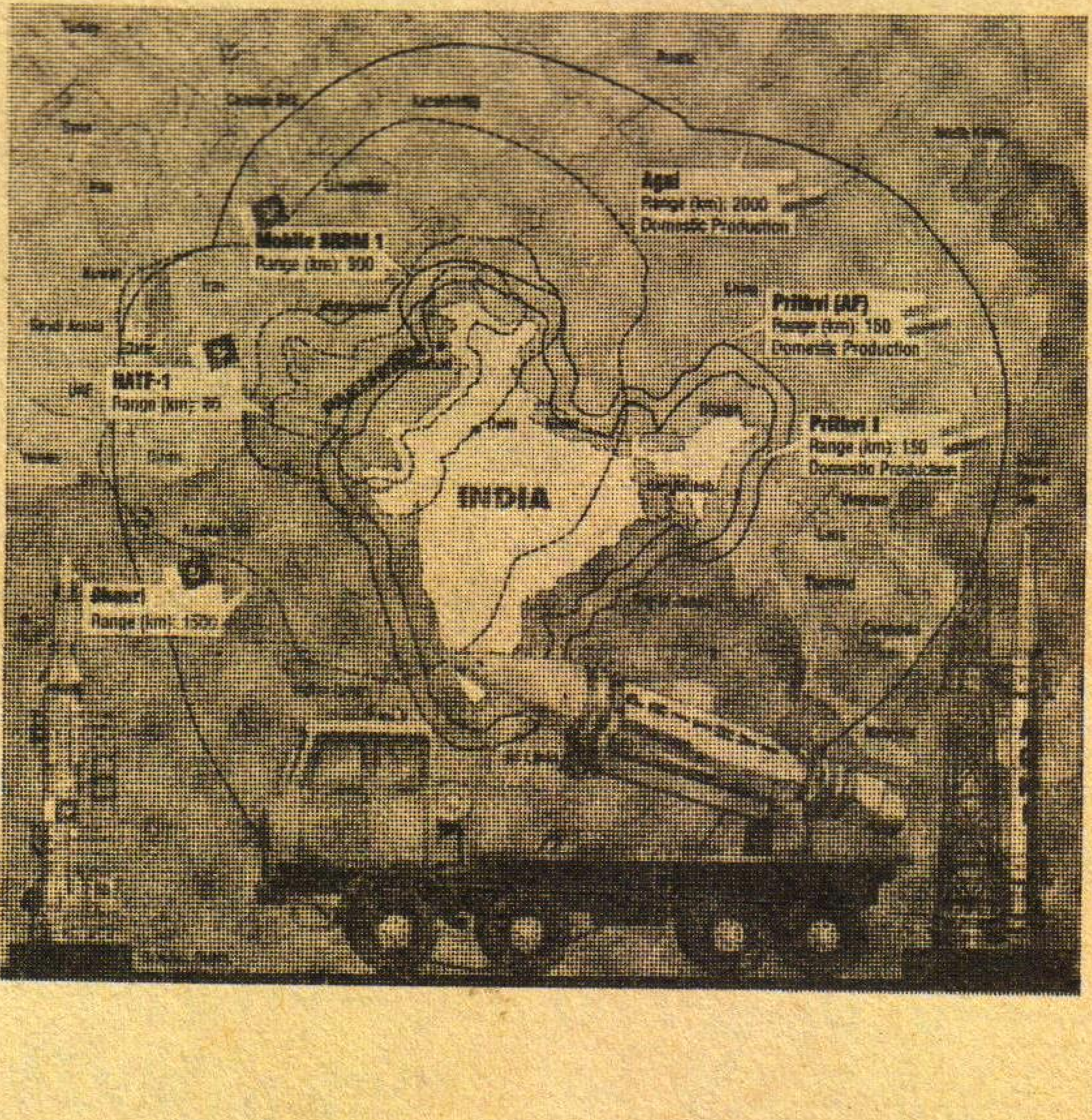
نیوکلیائی جنگ میں کوئی فریق فاتح نہیں ہوتا۔ ہند اور پاکستان کے درمیان ہونے والی نیوکلیائی جنگ چوبیس گھنٹے بھی جاری نہیں رہے گی لیکن سرحد کے دونوں جانب دو نسلوں کو صفحہ ہستی سے مٹادے اور دونوں ملکوں کی دھجیاں بکھیر دی گی۔

سابق فوجی سربراہ جنرل کے سندرجی کے اندازے کے مطابق کہ اگر نیوکلیائی جنگ میں پہل پاکستان کی طرف سے ہوئی تو ہندوستان اپنے 10,25,800 افراد سے محروم ہوجائے گا اور اس کے علاوہ 2,078,700 افراد زخمی ہوں گے۔ ہندوستان کی طرف سے جوابی کاروائی ہونے پر پاکستان کے 1360,940 افراد موت کے گھاٹ اتر جائیں گے، 4,120,940 افراد گھائل ہوں گے۔

ہندوستان میں دہلی اور ممبئی اور پاکستان میں کراچی، لاہور اور اسلام آباد جیسے میٹرو پولیٹن شہروں کا وجود ہی ختم ہوجائے گا۔ ریڈیائی تاب کاری کے زیر اثر پورے کے پورے شہر قبرستان میں تبدیل ہوجائیں گے۔

نیوکلیائی جنگ کا کھٹکا دبانا سیاسی اعتبار سے ہندوستانی اور پاکستانی دونوں حکومتوں کے لیے جان لیوا ثابت ہوگا۔ جنگ کی پہل کرنے اور جوابی کاروائی کا راستہ اختیار کرنے کے درمیان کوئی فرق اس بناء پر نہیں رہ جائے گا کہ اس کی لائی ہوئی تباہی اس قدر ہلاکت خیز اور بھرپور ہوگی کہ دونوں میں کوئی بھی ملک اس کے سماجی اور اقتصادی نتائج بد کا متحمل نہ ہوسکے گا۔

امن کے زمانے میں بھی نیوکلیائی ہتھیاروں کو بڑی قیمت چکا کر ہی رکھا جاسکے گا۔ ہتھیاروں کی ذخیرہ اندوزی کے مقصد سے ایک ادنی ترین درجے کی اسٹراٹیجی رکاوٹ تعمیر کرنے کے لیے دس سے پندرہ کروڑ روپئے کی رقم درکار ہوگی۔ جیسا کہ جنرل سندرجی کا خیال ہے کہ مثال کے طور پر دس چینی اور پانچ پاکستانی شہروں کو تباہ کرنے کے لیے ہندوستان کو 4520 کلوٹن بم کی ضرورت ہوگی۔ صرف ان ہتھیاروں کی تیاری پر ہی کئی کروڑ روپے خرچ ہوجائیں گے۔ انہیں اسٹور کرنے کے لیے خصوصی انتظامات اور سہولتیں درکار ہوں گی۔ اس طرح ایک مسئلہ سامنے آئے گا پلوٹونیم اور یورینیم پروسسنگ پلانٹوں سے نکلنے والے ریڈیائی فضلے کی بڑی مقدار کو ٹھکانے لگانے کا۔ اس مسئلہ کا اندازہ امریکہ کی مثال سے لگایا جاسکتا ہے جو ایسے فضلے کے دس سال پر پھیلے ہوئے انتظامی پروگرام پر چالیس بلین ڈالر خرچ کرتا ہے۔



نیوکلیائی اسلحہ کاری کو کئی کروڑ روپے کی اضافی رقم بھی مطلوب ہوتی ہے۔ مؤثر کنٹرول کے لئے انٹیگریٹڈ کمانڈ اور کنٹرول اینڈ انٹلی جنس سنٹر قائم کرنے ہوں گے اور دونوں میں سے کسی بھی ملک کے پاس یہ اساسی سولیتیں موجود نہیں ہیں۔ ایک مبتدیانہ نوعیت کے C29 سسٹم کے لئے فوری طور پر تین سے پانچ ہزار کروڑ روپے صرف ہوں گے۔

نیوکلیائی اسلحوں سے آراستہ میزائل، راکٹ توپ کے گولے اور بم کا تقاضہ

ہے کہ ایک علیحدہ اسٹراٹیجی نیوکلیائی فورس قائم کی جائے جس کے الگ الگ مرکزی اور علاقائی ڈائرکٹوریٹ کھولے جائیں اور اس پورے سلسلے کی کمانڈ ایک ایسے افسر کے ہاتھ میں ہو جس کے اختیارات تینوں فوجی سربراہوں سے زیادہ ہوں۔ ان سب اقدامات کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دفاعی افواج میں کٹوتی کرنے کے بجائے ہند اور پاکستان دونوں ہی کو اضافی مالی بوجھ اٹھانا پڑے گا۔ مثلاً ہندوستان کو نیوکلیائی فورس کو ٹھیک طرح رکھنا ہے تو ایک محتاط انداز کے مطابق اس سال اپنے دفاعی بجٹ کے لیے اسے پچاس ہزار کروڑ روپے کی ضرورت ہوگی۔

نیوکلیائی جنگ بے شک ان بجٹ سے مربوط قیاسات اور تخمینوں کو بے مصرف کردے گی۔ نیوکلیائی دھماکے کے بعد کسی بھی ملک کی معیشت اور مالیاتی نظام بکھر کر رہ جائے گا۔ روپے کی کوئی قیمت رہ نہیں جائے گی۔ ایسے کسی حملے کے چند گھنٹوں کے اندر بینک کاری کا نظام بیٹھ جائے گا اور کرنسی نوٹوں کی حیثیت نفاست سے چھپے اور ترشے ہوئے کاغذوں کے بنڈل سے زیادہ نہیں ہوگی۔ پنجاب، ہریانہ اور اترپردیش کی کئی لاکھ ایکڑ زرخیز زمین ریڈیائی اثرات سے یا تو بنجر ہوجائے گی یا جگہ جگہ سے اس میں گڈھے پڑجائیں گے۔ غذائی اجناس کی پیداوار اس حد تک گرجائے گی کہ پنجاب کی منڈیاں خریداروں کو ترسیں گی۔ دونوں ملکوں پر بیس سال تک قحط کا سایہ مسلط رہے گا۔ چند ہفتوں کے اندر تمام انڈسٹریاں ٹھپ ہوجائیں گی کیونکہ ان میں کام کرنے والے افراد یا تو مرچکے ہوں گے یا زخمی اور لاپتہ ہوں گے۔ چونکہ دھماکے کی لہروں سے ہائیڈرو الیکٹرک اور تھرمل پاور اسٹیشن ناکارہ ہوچکے ہوں گے اس لیے فیکٹریوں میں قفل تک لگ جائے گا۔ سڑکیں اور گلیاں اندھیری ہوجائیں گی اور غیر استعمال شدہ ریلوے لائنیں کچلے ہوئے پیروں کی طرح مڑجائیں گی۔ سڑکیں اور پل وکاس مینار سے بھی اونچے ڈھیر میں تبدیل ہوجائیں گے۔

نیوکلیائی جنگ کے سماجی نتائج اور بھی تباہ کن ہوں گے۔ نہ جانے کتنے کروڑ بچے یتیم ہوجائیں گے جو بموں سے جھلسے ہوئے راستوں پر اور گلیوں میں روٹی کے ایک ٹکڑے کی تلاش میں مارے مارے پھریں گے اور کیچڑ سے اٹی ہوئی نالیوں میں سرڈال کر اپنی پیاس بجھائیں گے۔ ان میں سے بیشتر بھوک و پیاس اور بیماری سے مرجائیں گے۔ زخمیوں کو اسپتال تک پہنچنا نصیب نہ ہوگا۔

چند ہی کلینک اور میڈیکل کیمپ بچ رہیں گے جہاں امداد اور علاج کے لیے جمع ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑنے والے انسان برساتی کیڑوں مکوڑوں کی طرح مریں گے۔ فسادات ٹریفک جام کی طرح روزمرہ زندگی کا معمول بن جائیں گے۔ زندہ بچ رہنے والے انسان بھوک اور افلاس سے مجبور ہوکر کوڑے دان میں سڑتی ہوئی روٹی کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کے لئے کسی شیرخوار کی جان لینے سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ مہذب زندگی کے تمام ضابطے جہد للبقا یعنی وجود کی جنگ کے سامنے بے معنی ہوجائیں گے۔

مرکز کے اختیارات نیوکلیائی تباہی کی نذر ہوچکیں گے تو دونوں ملکوں میں سیاسی ابتری پھیل جائے گی۔ کشمیر تا ناگالینڈ، میزورم اور تری پورہ خود کو آزاد ملک کہنے لگیں گے۔ پاک مقبوضہ کشمیر، سندھ، بلوچستان دنیا کے نقشے پر نئے ممالک کی حیثیت سے ابھریں گے۔ دوسرے علاقوں سے علیحدگی کا مطالبہ اور زور پکڑے گا۔ نیوکلیائی آفت کی ماری راجدھانیاں پرائے مال پر ہاتھ صاف کرنے کی تاک میں رہنے والے پڑوسیوں اور بین الاقوامی دلالوں کی ہوس کا شکار ہوجائیں گی۔

بس ایک بٹن دبانے کا بظاہر بے ضرر عمل ان نسلوں کی تقدیر پر مہر لگا سکتا ہے جو اپنے پہلے کی نسلوں کی طرح جینے کھانے پینے، سونے اور اپنے نسب کو آگے بڑھانے کے لیے پیدا ہوئی تھیں اور یہی سب کچھ وہ اس وقت تک نہیں کرسکیں گی جب تک نئی دہلی اور اسلام آباد میں بیٹھے حکمراں اپنے ہاتھ تباہی کے کھٹکے سے اٹھا نہیں لیتے۔ ▭

بقیہ: خواتین کا صفحہ

میں بچی کی ولدیت کی تصدیق کے لیے دیگر ترقی یافتہ ذرائع کیوں نہیں اختیار کیے گئے؟ یہاں سے آپ کے لیے ایک گنجائش پیدا ہوتی ہے کہ آپ اسی عدالت میں یا اس سے اوپر کی عدالت میں اپیل دائر کریں کہ ڈی این اے ٹیسٹ کی روشنی میں شخص مذکور اور اس بچی کے رشتے کا تعین کرکے آپ کو جائز حق دلایا جائے۔ زندگی کے تئیں جو بے اعتدالانہ رویہ آپ نے اختیار کیا اس کا جائزہ لیں اور اللہ سے صبر و استقامت اور مشکلات آسان کرنے کی دعا کرتی رہیں۔

بقیہ: آنکھوں دیکھا حال

ہندستانی آپریشنل کمانڈ دہلی سے کافی دور ایک محفوظ تر مقام پر دوسرے حملے کی تیاری میں ہیں۔ یہ ایک میزائل ایرکرافٹ آپریشن ہے جس میں نیوکلیائی اسلحوں سے لیس پرتھوی 150250 سکھوئی اور جاگور سب ایک طوفان کی شکل میں آگے بڑھتے ہیں۔ منٹوں میں اسلام آباد، کراچی، کوئٹہ اور حیدرآباد کھنڈر بنادیے جاتے ہیں۔ چار لاکھ افراد فوراً نیند کی آغوش میں سوجاتے ہیں۔ اگلے چند روز میں چھ لاکھ کے قریب اور سسک سسک کر جان دے دیں گے۔ لاکھوں ایسے ہیں جن کی زندگی ایک ماہ سے زیادہ وفا کرنے والی نہیں اور جس کے بعد وہ صبح کا منہ نہیں دیکھ سکیں گے۔

ہندوستان اور پاکستان کے مابین مستقبل کی نیوکلیائی جنگ کا

آنکھوں دیکھا حال

تحریر: ولسن جان

نارتھ بلاک میں واقع وزیر داخلہ کے ٹھنڈے اور اندھیرے دفتر میں کھٹکا دیا جارہا ہے۔ لمبی مستطیل میز کاغذات نقشے، گراف اور سرد پڑچکی چائے کے منقش کپ بکھرے ہوئے ہیں۔ میز کے گرد دس سنجیدہ افراد بیٹھے ہوئے رازدارانہ انداز میں گفتگو کررہے ہیں۔ اونچائی پر نصب کھڑکی سے خزاں کے سورج کی زرد روشنی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے وزیر داخلہ پر اپنا گھنیرا سایہ ڈال رہی ہے۔ چھت گیر کی طرف دیکھتے ہوئے وزیر وصوف کہتے ہیں "میرے خیال میں ایسا کرنے کے سوا ہمارے پاس کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔" پھر وہ میز سے کاغذات اٹھاتے ہوئے سرخ فائل میں رکھ لیتے ہیں جس پر لکھا ہوا ہے "ٹاپ سیکرٹ آپریشن گلمرگ" یہ فائل کشمیری دہشت گردوں کے خلاف جوابی دفاعی منصوبے پر مشتمل ہے جس کے تربیت کار ملٹری آپریشنز کے ڈائرکٹر جنرل ہیں جنہیں اپنے آقا یعنی آرمی چیف کی حمایت کے علاوہ ملٹری انٹلی جنس، ریسرچ اینڈ انالی سس ونگ RAW اور انٹلی جنس بیورو سے اہم معلومات حاصل ہوتی رہتی ہیں۔

مذکورہ منصوبے میں ایک پانچ روزہ فوجی کاروائی کی تفصیل دی گئی ہے جس کے تحت وادی کشمیر کو پوری طرح گرفت میں لینا، لائن آف کنٹرول پر نگرانی کو مزید چوکس کرنا اور دہشت گردوں کو جن میں سے بیشتر غیر ملکی لٹیرے ہیں، نکال باہر کرنے کے لیے چند دستے فوج کی ایر لفٹنگ کا انتظام کرنا ہے۔ اس منصوبے کا سب سے زیادہ جرات مندانہ حصہ ہندوستانی سپاہیوں کی گولی سے بچ کر پاک مقبوضہ کشمیر میں پناہ لینے والے دہشت گردوں کا سرگرم تعاقب ہے۔ اس تعاقب میں بری اور فضائی افواج دونوں شریک ہیں۔ نیم فوجی کمانڈو دستوں کو ہیلی کاپٹروں کے ذریعے اودھم پور کے علاقے میں اتارنا ہے تاکہ وہ پاک مقبوضہ کشمیر میں پاکستان کے قائم کردہ تربیتی کیمپوں کا صفایا کرسکیں۔ اصل کاروائی کو چوبیس گھنٹے کے اندر مکمل ہوجانا ہے اور ہلاکت کا دن 16 ستمبر مقرر ہوا ہے۔

یوم ہلاکت سے ایک دن پہلے سورج کی کرن ابھی پھوٹنے بھی نہیں پائی ہے کہ ایک تنہا مگ 25 فاکس بیٹ ٹی جہاز اترپردیش میں بریلی کے فوجی ہوائی اڈے سے اڑان بھرتا ہے اور ساڑھے پانچ منٹ میں اسی ہزار فٹ کی بلندی کو چھولیتا ہے۔ منٹوں کے اندر یہ جہاز پاک مقبوضہ کشمیر کے اوپر نظر آتا ہے جو اپنے بلند پیما راڈار کی مدد سے اس علاقے کی جغرافیائی تفصیلات کا جائزہ لے رہا ہے۔ اس کے ہائی ریزولیوشن کیمرے زمین پر ہونے والی ہر نقل و حرکت کی پوری جزئیات کے ساتھ تصویر کشی کررہے ہیں۔ دوپہر ہونے تک ان کیمروں سے کھینچی گئی تصویروں کے بڑے بڑے پرنٹ ایک خصوصی ایلچی کے ذریعے اودھم پور میں فوج کے ناردرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر کو روانہ کردی جاتی ہیں جہاں پر فوجی افسران اعلی اگلی صبح کے اقدام کا منصوبہ بنارہے ہیں۔



موسم خزاں کی صبح میں وادی پہلے کی طرح نکھری ہوئی ہے۔ صاف نیلگوں آسمان کے نیچے پیرپنجال کے پہاڑی سلسلوں پر تازہ برف کے گالے ڈل جھیل کے گدلے پانی کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں۔ جیسے جیسے فوجیں اے کے 47 اور 15_56 اسالٹ رائفلوں سے مسلح ہوکر وادی کے اندر دہشت گردوں کے ٹھکانوں

اور مراکز کی طرف بڑھتی ہیں تو محض علامتی مزاحمت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ دن ڈھلنے تک آپریشن گلمرگ پورے شباب پر پہنچ چکا ہوتا ہے۔

پٹھان کوٹ سے دو ایم آئی ال ایم آئی 26 ہیلی کوپٹر جن میں سے ہر ایک میں 85 پوری طرح مسلح کمانڈو سوار پاک مقبوضہ کشمیر سے اڑان بھرتے ہیں۔ حملہ کامیاب ہو رہا ہے۔ اس میں کم از کم بیس کیمپ تباہ ہوئے ہیں، دو اسلحہ خانے جلے ہیں اور ایک پل اڑایا گیا ہے لیکن جیسے ہی چاپر ہالی کاپٹر واپسی کی اڑان کے لیے اوپر اٹھتے ہیں، طیارہ شکن بندوقوں سے نکلی ہوئی گولیوں کی بوچھار نے ان کے پرخچے اڑا دئے اور شعلوں میں لپیٹ دیا۔ زندہ کوئی بھی نہ بچا۔

پاکستانی فوج نے جو اگرچہ شروع میں حیرت زدہ رہ گئی تھی، بھاری خودکار بندوقوں سے مسلح چند سو فوجی دستے پاک مقبوضہ کشمیر میں ہندوستانی حملے کا جواب دینے کے لیے بھیجے ہیں۔ لائن آف کنٹرول سیاچن پر دو طرفہ فائرنگ کی بڑھتی ہوئی شدت سے وہاں کا ماحول کافی گرم ہو اٹھتا ہے۔ مغربی سیکٹر میں دونوں طرف سے ٹینکوں کی آمد و رفت ہو رہی ہے اور ان کے ساتھ ہی فوجیوں کو لے جانے والی بکتر بند گاڑیاں بھی گھوم رہی ہیں۔

نئی دہلی کے ساؤتھ بلاک میں کمرہ جنگ عملی کاروائیوں کا ہیڈ کوارٹر بن جاتا ہے۔ ادھر اسلام آباد میں وزیر اعظم فوج کے سربراہ سے ایک مختصر میٹنگ کر کے انہیں میزائل یونٹ کمانڈ اور کنٹرول سنٹر کو مستعد رکھنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ ہندوستان میں پرتھوی میزائل پہلے ہی سرحد کے پچاس کلو میٹر اندر تک گھس چکے ہیں۔ بعض میزائلوں میں نیوکلیائی جنگی اسلحے بھی نصب ہیں۔

آسمان پہلے ہی آگ میں جل رہا ہے۔ لیزر گائیڈڈ اسلحے اور دور اثر بم ڈھونے والے میراج 2000 جہازوں کی قطار گوالیار فوجی ہوائی مستقر سے کاہوتا کے لیے روانہ ہو چکی ہے۔ امبالہ اور پونے میں کھڑے ہوئے جاگدار جنگی جہاز بھی ایسی ہی مہم پر نکل کھڑے ہوئے ہیں تاکہ نیوکلیائی جنگی اسلحہ برداری کے اہل F16 طیاروں کے اکلوتے پاکستانی فضائی بیڑے کے مستقر کو تباہ کر سکیں۔ ایک اکیلا سکھوئی Sykhoi جنگی طیارہ جس میں تھرمو نیوکلیر ڈیوائس نصب ہے۔ پونے کے نزدیک لوہے گاہوں ہوائی مستقر پر مد فاضل میں تعینات کیا گیا ہے تاکہ ہنگامی صورت حال

اس منصوبے کا سب سے زیادہ جرأت مندانہ حصہ ہندوستانی سپاہیوں کی گولی سے بچ کر پاک مقبوضہ کشمیر میں پناہ لینے والے دہشت گردوں کا سرگرم تعاقب ہے۔ اس تعاقب میں بری اور فضائی افواج دونوں شریک ہیں۔

اگلے چند روز میں چھ لاکھ کے قریب اور سسک سسک کر جان دے دیں گے۔ لاکھوں ایسے ہیں جن کی زندگی ایک ماہ سے زیادہ وفا کرنے والی نہیں اور جس کے بعد وہ صبح کا منہ نہیں دیکھ سکیں گے

میں کام آئے ان سب کا نشانہ اسلام آباد ہے۔ پاکستان کے J.6 اور میراج جنگی طیارے امبالہ، ہلواڑہ اور ممبئی کی طرف پرواز کر رہے ہیں۔ ان کا ہدف ہوائی مستقر اور نیوکلیائی تحقیق کے مراکز ہیں۔ دو F 16 ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک میں دس کلوٹن کے نیوکلیر بم نصب ہیں۔ انہیں دہلی کی طرف پرواز کے انتظار کا حکم دیا گیا ہے اور ان کا نشانہ سیدھا راشٹرپتی بھون ہے۔

فضائی جنگ کی تاریخ میں ایک خطرناک ترین حملے میں کاہوتا اور چشمے کے پروسسنگ پلانٹ تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ سرگودھا میں واقع پاکستان کا ایمونیشن ڈپو جہاں اس کے ہتف اول اور دوم میزائل رکھے گئے تھے، جل کر راکھ ہو چکا ہے۔ اس کے بیشتر کمانڈ اور کنٹرول مراکز جل رہے ہیں۔ پاکستانی جیٹ طیاروں نے بھابھا اٹامک سنٹر کو تباہ کر ڈالا ہے۔ ہلواڑہ، سرسا اور امبالہ کے ہوائی مستقروں کو تاک کر بم کا نشانہ بنایا ہے۔ صرف آر سی سی سے بنے بنکروں میں کھڑے مگ طیارے ہی اس تباہی سے بچ سکے ہیں۔ لیکن اسلام آباد میں ہلچل مچی ہوئی ہے کیونکہ اس کی نیوکلیائی مراکز میں سے بیشتر ناقابل مرمت حد تک تباہ ہو چکے ہیں اور اس کا ڈلیوری سسٹم مفلوج ہو چکا ہے۔ فوجی سربراہ صدر مملکت سے رابطہ قائم کر کے کھٹکا دبانے کے لیے کہتا ہے۔ صدر مملکت 1971 کے زمانے کی معروف شخصیتوں میں سے ہے۔ اسے فوجی سربراہ کے رائے سے اتفاق ہے۔ نیوکلیائی اسلحوں سے آراستہ دو F 16 طیارے دہلی کی طرف پرواز کرتے ہیں۔

وجے پتھ پر ٹریفک کی بھیڑ بھاڑ سے چند گز کے فاصلے پر پے در پے بم گراتے جا رہے ہیں۔ دھماکوں سے نارتھ اور ساؤتھ بلاک کی سرخ پتھر کی دیواریں زمیں بوس ہو جاتی ہیں۔ راشٹرپتی بھون کو جانے والی سڑک زمین پھٹ جانے سے آہنی دروازوں کو سنبھالنے والے لمبے ستون سرنگوں ہو جاتے ہیں اور راشٹرپتی بھون کی برجی نیچے لڑھک جاتی ہے۔ لمحے بھر میں مغل گارڈن میں خاک اڑنے لگتی ہے۔ پارلیامنٹ ہاؤس کے ستون ماچس کی تیلیوں کی طرح سے گرنے اور ٹوٹنے لگتے ہیں۔ آکاش وانی بھون شعلوں میں کھڑا ہوا ہے۔ چوبیس گھنٹوں کے اندر پانچ لاکھ افراد لقمہ اجل بن چکے ہیں۔ دو روز میں مزید دو دو لاکھ زندگیاں موت کی نذر ہو جاتی ہیں اور ایک ہفتے میں تین لاکھ اور دم توڑ دیں گے۔ مہینوں اور برسوں کے اندر لاشوں کے انبار لگتے جائیں گے اور ان کی آخری رسوم ادا کرنے کے لیے کوئی نفس باقی نہ رہے گا۔

باقی صفحہ ۱۷ پر

ذکر نیوکلیائی دھماکوں کا...

تحریر: مرشد کمال

راس برینن (Ross Brennen) میرے استاد ہی نہیں اچھے دوست بھی ہیں۔ لندن میں دوران تعلیم ان سے کافی استفادہ کا موقع ملا پچھلے دنوں روایتی کوالیٹی گروپ کے ایک جلسے سے خطاب کرنے وہ دبئی کے Grand Forte ہوٹل میں تشریف لائے تو میری ان سے ملاقات ہوئی۔ مل کر وہ بہت خوش ہوئے اور خیریت دریافت کی۔ اپنی گوناگوں مصروفیت کے باوجود انہوں نے مجھے رات کا کھانا ساتھ کھانے کی دعوت دے ڈالی۔ میں نے بھی ان سے گفتگو کے موقع کو غنیمت جان کر ان کی خدمت میں حاضری کی حامی بھرلی۔

رات کو میں خلاف معمول وقت مقررہ سے تقریباً پندرہ منٹ پہلے پہنچ گیا، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ راس وقت کی خاصی پابندی کرتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ لندن میں میرے Dissertation کے متعلق چند ضروری ہدایات دینے کے لئے انہوں نے مجھے اپنے چیمبر میں بلایا تھا، موسم کی خرابی کی وجہ سے مجھے وہاں پہنچنے میں تاخیر ہوگئی تھی جب میں ان کے چیمبر کے قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ راس اسی موسم میں اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق رین کوٹ اور ہیٹ لگا کر جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔

مجھے وہ باہر ہی ہوٹل کی لابی میں بڑی بے تابی سے ٹہلتے ہوئے مل گئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی گہرے غور وفکر میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے میرا استقبال کیا اور وہیں لابی میں لگے انٹرکام پر کھانے کا آرڈر دے کر ہم لوگ کمرے میں آبیٹھے۔

گفتگو کی شروعات لندن کے موسم اور سیاست سے ہوئی۔ ٹونی بلیئر کی حکومت کا بھی جائزہ لیا گیا۔ Middlesex University کے حالات اور واقعات کا ذکر ہوتا رہا۔ ماحولیات کی آلودگی کا شکوہ کئے بغیر بھی راس نہ رہ سکے۔ اسی دوران Hotel Attendant کھانے کی ٹرالی لے کر کمرے میں داخل ہوا اور راس نے مجھے کھانے کی میز پر آنے کا اشارہ کیا۔

کھانے کی شروعات کے ساتھ گفتگو کا موضوع بھی تبدیل ہوگیا۔ بے تکلف گفتگو اور دوران گفتگو مذاق کا ایک خاص انداز اختیار کرنے والے راس بھارت میں فسطائی قوتوں کے عروج اور حالیہ ایٹمی دھماکوں سے کافی متفکر نظر آئے دنیا کے مختلف حصوں میں امن کے لئے کی جارہی کوششوں اور دنیا کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک کرنے جیسے دعووں پر خلوص دل سے عمل نہ کرنے پر انہوں نے امریکا اور یوروپ کے رویے پر افسوس کا اظہار کیا۔ راس کو اس بات کا بھی قلق ہے کہ ان کے اپنے ملک کی پالیسی اس سلسلے میں غیر واضح اور ان کے حکمرانوں کی نیت صاف نہیں ہے۔ دوران گفتگو انہوں نے بھارت اور پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے متعلق کچھ ایسے تلخ حقائق پر مبنی سوالات اٹھائے جس سے مجھے تھوڑی دیر کے لئے اپنے ہندوستانی ہونے پر سخت شرمندگی کا احساس ہونے لگا۔



راس تو اپنی دھن میں کہہ گئے بغیر اس بات کی پرواہ کیے کہ ان کے خیالات مجھ جیسے حساس دل ہندوستانی کے لئے کس حد تک تکلیف دہ اور ذہنی پریشانی کا سبب بنتے ہیں۔ شاید میری جگہ کوئی اور ہوتا یا میں بھی راس کے خلوص اور انسان دوستی سے واقف نہ ہوتا تو ان کے خیالات کو تعصب اور نسل پرستی سے تعبیر کرتا۔ راس کے ذریعہ اٹھائے گئے سوالات نے میرے اندر ایک انتشار برپا کردیا، میرے وجود کے تار جھنجھنا اٹھے۔

راس کے سوالات کا بوجھ لئے اس رات جب میں ہوٹل سے لوٹ رہا تھا تو ایک ایک سوال کا ہر زاویہ سے جواب ڈھونڈھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاید کوئی ایسا پہلو ہو جس کا احاطہ کرنے میں راس کی فکر ناکام رہی ہو اور اسی پہلو میں شاید ان کے سوالوں کا جواب پوشیدہ ہو۔ لیکن انتہائی غور وفکر اور حالات کا ٹھنڈے دل سے تجزیہ کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ دراصل راس کے سوالوں کا جواب ڈھونڈھ پانا

Ross کو اس بات کا بھی قلق ہے کہ ان کے اپنے ملک کی پالیسی اس سلسلے میں غیر واضح اور ان کے حکمرانوں کی نیت صاف نہیں ہے دوران گفتگو انہوں نے بھارت اور پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے متعلق کچھ ایسے تلخ حقائق پر مبنی سوالات اٹھائے جس سے مجھے تھوڑی دیر کے لئے اپنے ہندوستانی ہونے پر سخت شرمندگی کا احساس ہونے لگا۔

ممکن نہ تھا کہ ہم نے دراصل پچاس سالوں سے ان سوالوں سے فرار کی راہ اختیار کی ہوئی تھی۔

مجھے ہندوستانی سیاست دانوں کے اس دعوی میں بھی مکر و فریب، چودھراہٹ اور فسطائیت کی بو آرہی تھی جس میں انہوں نے ایٹمی دھماکوں کو National Pride سے تعبیر کیا تھا اور میرے لئے سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ جوہری دھماکے کے پیچھے قومی جذبہ نہیں بلکہ خالص ہندوانہ فکر کام کررہا تھا جس کا مقصد ملکی سلامتی نہیں بلکہ خطے پر ہندو بالادستی اور رعب قائم کرنا تھی۔

راس کے ذریعہ اٹھائے گئے سوالات ظاہر ہے ہندوستان میں سیاسی اور معاشی بدامنی، تعلیم، صحت، پینے کے صاف پانی کی قلت اور ایسے نہ جانے کتنے ان بے شمار مسائل کی طرف تھی جہاں عام طور پر ہمارے سیاست دانوں کی نظریں نہیں پہنچ پاتیں یا وہ اس تعلق سے شترمرغیانہ رویہ اپناتے ہیں۔

دراصل واقعہ یہ ہے کہ طاقت اور حکومت کے نشے میں چور برہمن سامراج نے فلاحی مملکت ہند اور اس کے مظلوم عوام کو گھر کی باندی کی طرح استعمال کیا ہے۔ عوام کی زندگی اور موت سے جڑے سوالوں کو حل کرنے کے بجائے انہیں مختلف مسائل میں الجھائے رکھنے اور پڑوسی ممالک سے اپنے سیاسی مفاد کی خاطر تعلقات میں کشیدگی برقرار رکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج بھی ہم دنیا کے سامنے بھوکے، ننگے اور قرض پر پلنے والے ملک کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ بین الاقوامی منظرنامے پر ہمارے ملک کی اس تصویر سے ہمارے حکمرانوں کو کبھی شرمندگی کا احساس نہیں ہوتا اور وہ ہمیشہ بیرون ملک ہماری امیج کو ہندوستانی عوام کے سامنے رکھنے میں غلط بیانی اور پردہ پوشی سے کام لیتے ہیں اور ایسا تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ گویا ہندوستان بیرونی ممالک کی نظر میں بڑی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے والے ملکوں میں شامل ہوگیا ہو۔

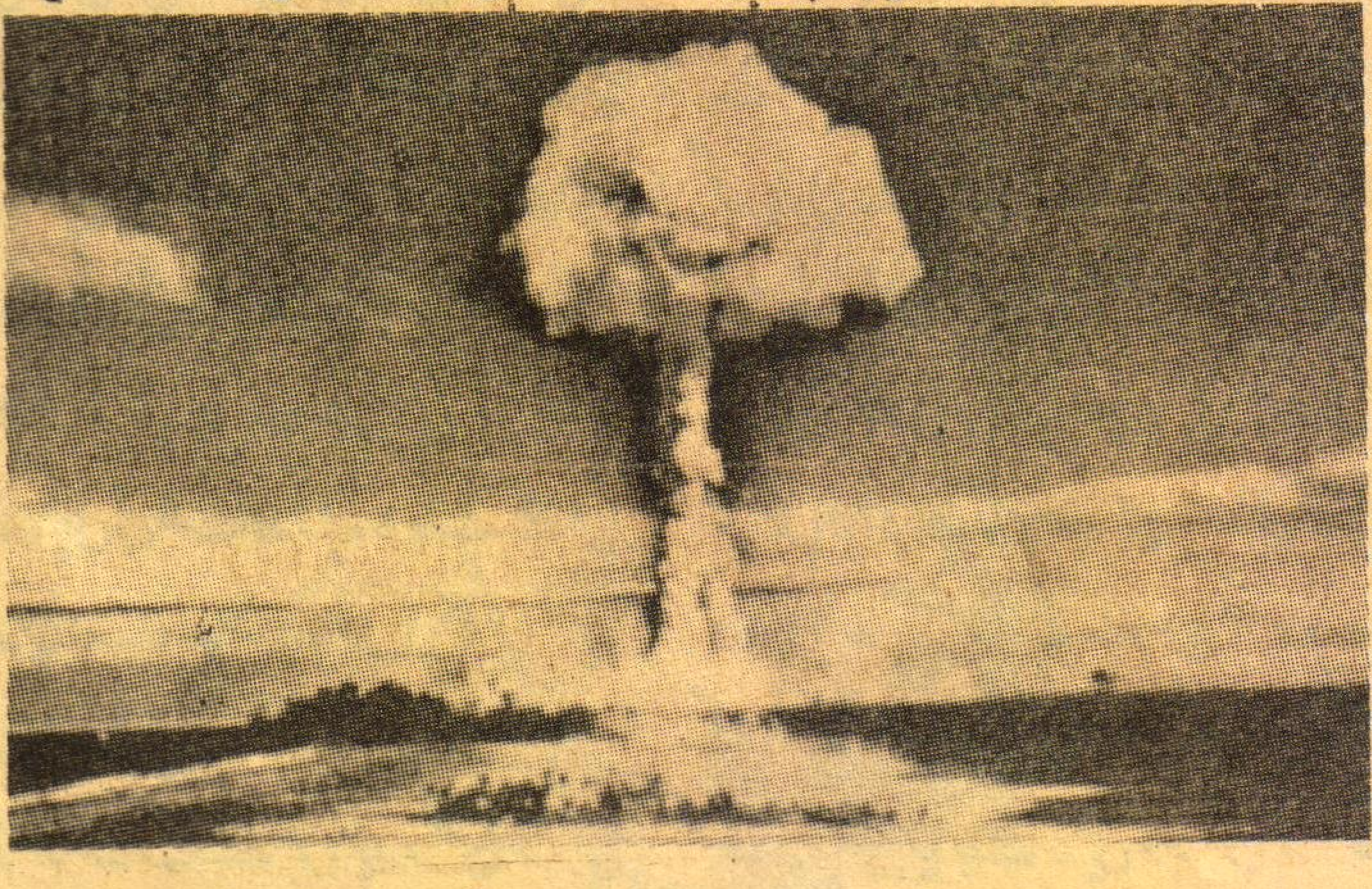
آئیے اب ان محرکات کا جائزہ لیں جس کے نتیجے میں دہلی کی فاشسٹ حکومت کو اس قلیل مدت میں نیوکلیائی دھماکوں کے ذریعہ ملکی سلامتی کو پڑوسیوں کے ممکنہ خطرات سے محفوظ کرنا پڑا۔ آخر پاکستان اور چین نے اچانک کون سے ایسے نیوکلیائی معجزات کرلیے تھے جس کی وجہ سے بھارت اپنے آپ کو اچانک غیر محفوظ محسوس کرنے لگا تھا۔ اگر نیوکلیائی دھماکوں کا ملک کی غیر یقینی صورت حال اور مرکز میں بی جے پی کی قیادت میں کمزور حکومت اور اس کے ناقابل اعتبار Alliance Parties کے پس منظر میں جائزہ لیا جائے تو یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ نیوکلیائی دھماکہ کی ایک وجہ اندرون ملک سیاسی کشمکش اور اپنے مخالفین پر سبقت لے جانے کی بی جے پی کی ایک چال تھی۔ ایک بار پھر ہندوؤں کے جذبات سے کھلواڑ کرکے اس سے سیاسی فائدے اٹھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ بی جے پی کو قیام حکومت کے روز اول سے ہی یہ احساس ہونے لگا تھا کہ مختلف جماعتوں کے اس مرکب کو جس میں وہ جماعتیں بھی شامل تھیں جن پر بدعنوانی کے سنگین الزامات عائد تھے اور وہ حکومت میں اس لئے شامل ہوئی تھیں کہ انہیں ریاستی تحفظ مل سکے کہ ان کے ساتھ چلنا کتنا مشکل ہوگا۔ کسی وقت بھی زمام اقتدار کے پھسل جانے کے خوف نے انہیں ایک نئے انتخاب کی تیاری کے لئے جوہری دھماکے کی مدد لینے پر مجبور کردیا۔ بی جے پی کو یہ اندازہ ہوچلا تھا کہ رام مندر، کشمیر اور یونیفارم سول کوڈ کی بنیاد پر اکثریت حاصل نہیں کی جاسکتی اور دوسری طرف اپنے سیاسی دوستوں کے علاقائی اور ذاتی مفاد کی وجہ سے ان پر بھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یونیفارم، سول کوڈ، آرٹیکل 370 اور رام مندر جیسے مسائل کو وقتی طور پر خیرباد کہہ کر حکومت سازی کا واحد مقصد مستقبل کے لئے مزید منصوبہ بندی اور اکثریت حاصل کرنے کے لئے کسی ایسے پائیدار ایشو کی تلاش تھی جس کے نتیجے میں آر ایس ایس کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کیا جاسکے۔ یہی وجہ تھی کہ انتخابات کے نتائج سے پیداشدہ غیر یقینی صورت حال میں بی جے پی کو اپنے تمام اصولوں سے سمجھوتہ کرکے صرف حکومت سازی میں دلچسپی تھی۔ بی جے پی کے سربراہان آج بھی اس بات کا برملا اظہار کرتے ہیں کہ قومی ایجنڈا دراصل مجبوری کا ایجنڈا ہے اور موقع ملتے ہی وہ بی جے پی کے اصل ایجنڈا One Nation, One Calture کو عمل میں لانے کی کوشش کریں گے۔

ایٹمی دھماکوں سے اپنے جارحانہ عزائم کی تکمیل کے لئے بی جے پی نے جہاں ایک طرف پاکستان کو خبردار کیا کہ اگر ضرورت پڑی تو بی جے پی اکھنڈ بھارت کی تعمیر

جوہری دھماکہ دراصل بی جے پی کے فاشسٹ عزائم کی تکمیل کی ایک کڑی ہے جس کے پیچھے آر ایس ایس کے تخلیق کار ہیڈ گیوار کی وہ ذہنیت کام کررہی ہے جس کے تحت مسلمانوں کو خوف کی نفسیات میں مبتلا کرکے ان پر تہذیبی تفوق قائم کیا جاسکے

کے لئے نیوکلیائی ہتھیاروں کا استعمال کر سکتی ہے وہیں سنگھ کے لوگوں نے پورے ملک میں جشن مناکر اور مٹھائیاں تقسیم کر کے مسلمانوں کو یہ تاثر دیا کہ تلوار اور ترشول کے دن اب گئے اب سنگھ جوہری اسلحوں سے لیس ناقابل تسخیر قوت کی حیثیت سے ابھرا ہے۔

یوں دیکھا جائے تو بے جے پی نے ایسی سیاسی چالوں سے اپنے مخالفین اور وقتی دوستوں کو چاروں خانے چت کر دیا ہے۔ بابری مسجد کے انہدام کا الزام اسے وقتاً فوقتاً پریشانیوں میں ڈالتا رہتا تھا۔ بی جے پی نے ہندتو کے بدنما داغ کو بھارتی نیشنلزم کے خوشنما نعروں سے دبانے کی کوشش کی ہے اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ سامنے آرہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بابری مسجد کے انہدام پر جہاں ہندوؤں کی ایک کثیر آبادی نے اپنی ناراضگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا وہیں ہندوؤں کی اکثریت بی جے پی کے اس عمل کو جرات مندانہ اور ملکی سلامتی کے لئے ضروری قرار دیتی ہے۔ بی جے پی کو اس حقیقت کا خوب اندازہ ہو چلا تھا کہ ہندوؤں کی وہ آبادی جو بی جے پی کے جارحانہ عزائم سے اتفاق نہیں رکھتی جب تک اس کے ساتھ نہیں آجاتی اس کے لئے تنہا حکومت بنانا ناممکن ہوگا۔ جوہری دھماکہ دراصل ہندتو کو Indian Nationalism میں تبدیل کر دینے کی بی جے پی کی اسی کوشش کا حصہ ہے۔



البتہ اس پورے عمل میں سب سے تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ کسی بھی مسلم تنظیم، سیاسی لیڈر یا مسلم دانشور نے بی جے پی کے اس خطرناک کھیل پر اعتراض کا اظہار نہیں کیا بلکہ بعض مسلم سیاست دانوں اور دانش وروں نے تو دوسرے لوگوں سے بڑھ چڑھ کر جوہری دھماکوں کا خیر مقدم کیا۔ کچھ نے اسے قومی فخر سے تعبیر کیا تو کچھ نے بی جے پی کے اس کارنامے پر خراج تحسین پیش کیا۔ مسلم سیاست دانوں یا دانشور حضرات بظاہر دکھاوے کے لئے بی جے پی کے اس عمل سے لاکھ خوش نظر آئیں حقیقت یہ ہے کہ بی جے پی کے اقتدار میں آنے اور پھر طاقت کا مظاہرہ کرنے سے ان کے اوسان خطا ہوئے ہیں اندر سے انہیں ایک خوف کھائے جا رہا ہے کہ اگر حالات اسی ڈگر پر چلتے رہے اور ملک اسی طرح خون آشام مستقبل کی طرف بڑھتا رہا تو وہ دن دور نہیں جب انہیں اپنے قوم پرست اور سیکولر ہونے کا ثبوت دینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ ان کے اندر پنپنے والے خاموشی کے کلچر نے انہیں موسم خزاں میں ہوا کے دوش پہ اڑتے ہوئے ان پتوں کی طرح بنا دیا ہے جن کی نہ کوئی منزل ہوتی ہے اور نہ مقصد وجود۔

خوف کی یہی وہ نفسیات تھی جس کی بنا پر کسی کی یہ جرات نہ ہو سکی کہ ملکی سرمایہ کو اس طرح بے ضرر، غیر ضروری کاموں اور ایک خاص فرقے کی چودھراہٹ کے لیے پانی کی طرح بہانے پر اعتراض کرے۔ بے شک چند سماجی تنظیموں اور امن کے رضاکاروں نے ملک کی بڑھتی بے روزگاری اور معاشی تنگی کے تعلق سے سوالات ضرور کیے لیکن اس میں بھی کسی قابل ذکر مسلم شخصیت کا نام ڈھونڈھنے سے نہیں ملتا۔ یہ لوگ اپنی دکھاوے کی قوم پرستی اور پاکستان کا ہمدرد کہے جانے کے خوف میں مبتلا ہیں کہ ان کے دماغ میں یہ چھوٹی سی بات فٹ نہیں ہوتی کہ ملک کے سرمایے میں ان کا بھی دوسری قوموں کی طرح برابر کا حصہ ہے۔ ملک میں معاشی پابندیوں، قحط اور قیمتوں میں اضافہ، غذائی اجناس کی قلت اور زرمبادلہ میں کمی انہیں بھی اتنا ہی متاثر کرے گی جتنا کہ برادران وطن کو۔

راس کے ذریعے اٹھائے گئے سوالات اتنے تلخ حقائق پر مبنی تھے کہ ان سے پہلو تہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ان کی اس بات میں بھی سو فیصد صداقت تھی کہ بھارت کے نیوکلیائی دھماکوں سے جنوب ایشیا میں ایک نئی سرد جنگ کا آغاز ہو جائے گا جس کا سب سے زیادہ نقصان ہندو پاک کے غریب عوام کو ہوگا۔ ابھی زیادہ دنوں کی بات نہیں جب دنیا کی دو بڑی طاقتیں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے ہتھیاروں کے دوڑ میں کچھ اس طرح شامل ہوئیں کہ انہیں اس بات کی فکر ہی نہ رہی کہ یہ سرد جنگ جس سے واپسی ممکن نہیں انہیں معاشی دیوالیہ پن کے قریب لے جا رہی ہے اور بالآخر دنیا نے دیکھا کہ سوویت یونین ٹکڑے ٹکڑے ہو کر دنیا کے نقشے سے غائب ہو گیا۔

بھلا ایک ایسے ملک میں جہاں آج بھی پیاس بجھانے کے لئے ندی اور گندے نالوں کے پانی پر قناعت کرنی پڑتی ہو، لوگوں کو تن ڈھانکنے کے لئے کپڑوں کے نام پر چیتھڑے ہوں، جہاں کروڑوں کی تعداد میں لوگ کھلے آسمان کے نیچے زندگی گزارتے ہوں، جہاں بھوک سے تڑپتا انسان غلاظت اور جنگلی چوہوں سے اپنے پیٹ کی آگ بجھاتا ہو، جہاں شیر خوار بچہ اپنے ماں کے آنچل میں دودھ نہ پاکر تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیتا ہو، جہاں معصوم بچوں کے ہاتھوں میں کتابوں کے بجائے ہتھوڑے یا کچرے جمع کرنے کے تھیلے پکڑا دیئے جاتے ہوں، جہاں حفظان صحت کا معقول انتظام نہ ہو اور مختلف وباؤں کے پھوٹ

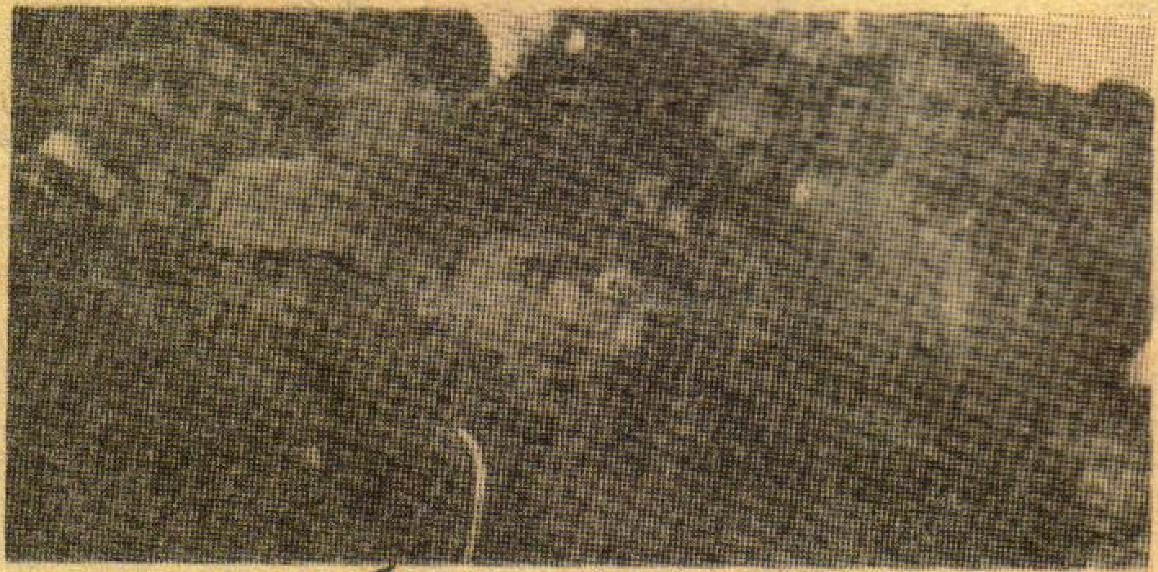
باقی صفحہ ۲۵ پر

آذربائجان کے غریب مسلمانوں پر

عیسائی مشن کا حملہ

آذربائجان میں ان دنوں مسیحی مشنری سرگرمیاں عروج پر ہیں جن کی وجہ سے ہزاروں آذربیجانی مسلمان ارتداد کے خطرہ سے دوچار ہوگئے ہیں۔ ایک اعلیٰ افسر جان عسکروف کا کہنا ہے کہ بڑھی ہوئی منظم مشنری سرگرمیوں کے نتیجہ میں حال ہی میں تقریباً 5 ہزار آذربیجانی مسلم باشندوں نے مذہب تبدیل کرکے عیسائیت قبول کرلی ہے۔ عسکروف نے یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا کہ یہ مسیحی تحریکات 2000ء کی آمد آمد تک ایک مسیحی سیاسی پارٹی کی تشکیل کے ذریعہ ملک کے سیاسی منظرنامے پر بھی مؤثر رول ادا کرنے لگیں گی۔ عسکروف کے مطابق ملک میں جاری ان کی سرگرمیاں حالیہ دنوں میں انتہائی حد تک تیز ہوچکی ہیں اور انتظامیہ بھی ان کے سامنے اپنے کو بے بس محسوس کررہی ہے، حالانکہ اس سلسلہ میں خود حکومت کو کافی تشویش لاحق ہے جس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ صدر جمہوریہ حیدر علیف نے جنوری 1997ء میں ان تحریکات کی سرگرمیوں پر روک لگانے کے احکامات جاری کیے تھے اور ان میں سے 20 تنظیموں پر حکومت نے کڑی پابندیاں عاید کرچکی ہے۔ ملک میں مشنریوں کے سینکڑوں ادارے کام کررہے ہیں جن میں کم ازکم 11 بڑے ادارے ایسے ہیں جو علانیہ مسیحیت کے پرچار پرسار میں مصروف ہیں۔ ان میں سے تین کو حکومت نے بند کردیا ہے۔ ان مسیحی اداروں اور تحریکوں کے طریقہ تبلیغ کے بارے میں عسکروف کہتے ہیں کہ وہ بے حد متنوع اور جدید ترین ہیں اور عوام کی بھاری تعداد کو متوجہ کررہے ہیں۔ مثلاً وہ راجدھانی باکو کے اندر موجود تھیٹر روم، فلم ہال اور مختلف تقریبات کے لیے بنائے گئے ہال کرائے پر لے کر ان میں اپنے مذہبی پروگرام کیا کرتے ہیں جس کی وجہ سے عوام کی شرکت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ مختلف علاقوں میں لڑکوں اور نوجوانوں کے لیے پکنک اور سیر و تفریح کے دلچسپ پروگرام بھی بڑے پیمانے پر کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں حکام سے تعاون بھی بھاری رشوت دے کر لے لیا جاتا ہے۔ باشعور حلقہ کے اندر یہ خیال بھی پایا جاتا ہے کہ امریکہ فن لینڈ اور سویڈن سے تعلق رکھنے والی تمام کمپنیاں اور ادارے جن میں سے بیشتر انسانی فلاح و بہبود کے کام کرنے کا دعوی کرتی ہیں، حقیقت میں مسیحیت کی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے اڈے بنے ہوئے ہیں۔ تحقیقات سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ امریکی پٹرول کمپنیاں، اسٹیٹ آئیل، روڈ آئل وغیرہ آذربیجان اور ملحقہ علاقے ترکمانستان میں جاری مشنری سرگرمیوں کو سرمایہ فراہم کرتی ہیں اور علاقہ کے باشندوں کی غربت، افلاس اور ناخواندگی سے بھرپور فائدہ اٹھارہی ہیں۔ حکام کے مطابق مشنری سرگرمیوں پر کیے جانے والے اخراجات کا تخمینہ 20 ملین ڈالر سالانہ سے بھی زیادہ ہے۔

عسکروف نے یہ بھی بتایا کہ مشنری سرگرمیوں میں مشغول سب سے بڑی تنظیم عالمی چرچ برائے آسمانی تحفہ ہے، جن کا بین الاقوامی مرکز امریکہ میں واقع ہے۔ مذکورہ چرچ کی جانب سے 21 افراد پر مشتمل ایک ٹیم 1991ء میں باکو پہنچی۔ مقامی افراد کے تعاون سے انہوں نے ثقافتی سرگرمیوں کے ذریعہ اپنے مشنری کام کا آغاز کیا اور اس کے لیے مختلف سطحوں پر کئی ادارے اور سوسائٹیاں قائم کریں جنہیں سرکاری طور پر منور بھی کرالیا گیا۔ چرچ مسیحیت کی نشر و اشاعت کے لیے آذربیجانی اور روسی زبانوں میں دو جریدے بھی شایع کرتا ہے اور اسی نے مشنری ٹریننگ کا ایک سنٹر بھی قائم کیا ہے، جس سے اب تک تقریباً 400 لوگوں کو باقاعدہ تربیت دے کر مشنری مبلغ کی سند دی گئی ہے، ان میں 250 مقامی باشندے ہیں اس مرکز نے ابتدا رفاہی کاموں سے کی تھی اس کے بعد یوروپی زبانیں سکھانے کے لئے مرکز برائے تعلیم زبان کا پروگرام شروع کیا گیا جس کی آڑ میں تبلیغی سرگرمیاں بھی شروع ہوگئیں۔ آسمانی تحفہ کے سلسلہ کو 2025 سال کے نوجوانوں میں زیادہ سے زیادہ عام کرنے پر ان کی قوت مرکوز ہے۔



تحریک زندگی نو۔ وولف اوکمان کی قیادت میں 1993ء سے ادارے نے کام شروع کیا، اس کی پشت پناہی سویڈن کی حکومت کرتی ہے گرچہ حکام نے کئی بار اس کو لگام دینے کی کوشش کی ہے، اس کے باوجود اس کی سرگرمیاں جاری ہیں اور فی الوقت اس کے 800 سے زیادہ ممبر ملک میں سرگرم ہیں۔ اس کے علاوہ تحریک عالمی فکر اور بچوں و نوعمروں کی نرسریوں کے ذریعہ سے نئی نسل کے ذہن میں مسیحی تعلیمات کی تخم ریزی کی جارہی ہے اور اسی طرح ان کے معصوم ذہنوں کو اسلام کے تعلق سے مسموم کرکے مسلمانوں سے ان کا تعلق توڑنے اور ان کو عیسائی بنالینے کی سرگرمیاں شدومد سے جاری ہیں۔ □

انڈونیشیا میں اسلام کی واپسی

لیکن ڈر ہے کہ انقلاب کو کوئی اور نہ اچک لے جائے

آبادی کے اعتبار سے انڈونیشیا دنیا کا دوسرا بڑا مسلم ملک ہے اور اگر ہندوستانی مسلمانوں کے سرکاری اعداد و شمار کو درست تسلیم کرلیا جائے تو اسے سب سے بڑی مسلم آبادی کا ملک قرار دینا پڑے گا۔ گذشتہ دنوں انڈونیشیا کے مختلف شہروں میں جو سیاسی اتھل پتھل دیکھنے میں آرہی ہے اسے مبصرین انقلابی کیفیت کا نام دیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اب صدر سوہارتو کے استعفی کے بعد ان کے نامزد کردہ صدر جیبی کے لئے بھی اقتدار پر برقرار رہنا مشکل ہوجائے گا۔ ملک بھر میں مظاہروں کا سلسلہ جاری ہے۔ لوٹ مار اور آتش زنی نے ملکی معیشت کو منجمد کر کے رکھ دیا ہے۔ اسکول اور کالج حکومت مخالت سرگرمیوں کے اڈے بن گئے ہیں۔ ہر لمحہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس افراتفری کے کوکھ سے ایک انقلاب برآمد ہونے کو ہے۔

انڈونیشیا میں گذشتہ چند برسوں میں تیز رفتاری کے ساتھ مادی ترقی آئی ہے اور پیسوں کی ریل پیل کے ساتھ ہی مغرب کی فرسودہ زوال زدہ ثقافت نے بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ شاہراہوں اور چوراہوں پر چلتے ہوئے اب اس بات کا گمان کم ہی ہوتا ہے کہ آپ کسی مسلم ملک میں موجود ہیں۔ فاسٹ فوڈ کا ریستوراں ہو یا روایتی قہوہ خانہ یا مشروب کی کوئی دکان، ہر جگہ مغرب کے تہذیبی مظاہر کو غلبہ حاصل ہے۔ پچھلے چند برسوں میں مادی ترقی نے نوجوانوں کو پاپ کلچر کا اسیر بنادیا ہے۔ صدر سوہارتو نے اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لئے عمداً اس بات کی کوشش کی کہ نوجوان نسل کو بے شعور دنیاوی زندگی جینے کے لئے وہ سارے سامان فراہم کردیئے جائیں چنانچہ ملک میں دیکھتے دیکھتے کاسینو، شراب خانے، سیاحت کے اڈے اور طوائفوں کے اڈے قائم ہوگئے اور پھر نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اس مادی زندگی میں اس طرح گردن تک ڈوبتی چلی گئی کہ اسے اپنے اردگرد کا کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ اسے یہ جاننے کی فرصت ہی نہ رہی کہ ملک کدھر جارہا ہے؟ اس کی معیشت کتنی مستحکم ہے؟ اور یہ کہ جو لوگ انڈونیشیا پر حکومت کررہے ہیں خود ان کے اپنے ارادے کیا ہیں؟ وہ واقعی انڈونیشیا کی ترقی کے لئے کام کررہے ہیں یا عام لوگوں کو لذت کی زندگی کا رسیا بناکر ملک پر خاندانی اجارہ داری کو مسلط رکھنا چاہتے ہیں۔ آنکھ اس وقت کھلی جب پانی سر سے اونچا ہوچکا تھا۔ گذشتہ دنوں ملیشیا کے جنگل میں جو آگ لگی تھی اس نے پاس پڑوس کے ممالک کی معیشت کو خاکستر کردیا۔ انڈونیشیا میں روپے کی قیمت اچانک گرگئی۔ سیاحی مقامات پر آمدنی میں زوال آگیا۔ اب بڑے بڑے پانچ ستارہ ہوٹلوں میں ہو کا عالم نظر آیا۔ حکومت نے ملکی معیشت کو سہارا دینے کے لئے جن نئے اقدامات کا اعلان کیا اس سے مہنگائی میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف ایک بے چینی کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ نئی نسل جو اب تک امریکی فلموں کا اسیر رہ کر ایک خواب آور حسین دنیا کا تصور رکھتی تھی اور جو یہ سمجھتی تھی کہ انڈونیشیا بھی آنے والے دنوں میں ایک ایسی دنیا میں تبدیل ہوجائے گا جہاں ہر شخص کے پاس بہت سے پیسے ہوں گے، امن ہوگا، سکون ہوگا اور ہر شخص کی دسترس میں لوازمات تعیش ہوگا۔ اسے اس نئی اچانک غیر متوقع صورت حال سے جھٹکا لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اسلام کے غلبے کے لئے یا کسی سنجیدہ مسئلے پر حکومت سے ٹکر لینے کے لئے کبھی تیار نہ ہوتے تھے وہ اب روٹی کی قیمت اچانک بڑھ جانے پر سڑکوں پر نکل آئے اور بہت سے نوجوانوں کو یہ لگنے لگا کہ اب تک اسلام پسند تنظیمیں جس خطرناک مستقبل کی طرف اشارہ کرتی رہی تھیں، ان کی باتوں میں صداقت تھی اور ایک تاثر یہ پیدا ہوچلا کہ انڈونیشیا کے مستقبل کی حفاظت سوہارتو اور ان کے حواریوں کے ذریعے نہیں ہوسکتی بلکہ ملک میں ایک متبادل سیاسی قیادت کی ضرورت ہے۔



☆ صدر سوہارتو اپنا استعفی لکھتے ہوئے

آج انڈونیشیا میں ملک بھر میں جو مظاہرے ہورہے ہیں اس میں اسلام پسند

آج انڈونیشیا میں ملک بھر میں مظاہرے ہو رہے ہیں اس میں اسلام پسند تنظیموں اور خاص طور پر نہضۃ العلماء کو کلیدی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ ملک میں اس وقت اگر کوئی منظم گروہ ہے جو صدر سوہارتو کی مخالفت کی تحریک کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا سکتا ہے تو نہضۃ العلماء سے یا پھر سابق صدر سوہارتو کی بیٹی ہیں جن کے ارد گرد لوگوں کا خاصہ بڑا حلقہ جمع ہوگیا۔

تنظیموں اور خاص طور پر نہضۃ العلماء کو کلیدی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ ملک میں اس وقت اگر کوئی منظم گروہ ہے جو صدر سوہارتو کی مخالفت کی تحریک کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا سکتا ہے تو وہ نہضۃ العلماء سے یا پھر سابق صدر سوکارنو کی بیٹی ہیں جن کے ارد گرد لوگوں کا خاصہ بڑا حلقہ جمع ہوگیا۔ آج کل جو لوگ انڈونیشیا کو ایک نیا مستقبل دینے کی تحریک چلا رہے ہیں ان کی نگاہیں ان ہی دونوں پر مرکوز ہیں۔ نہضۃ العلماء کو ان معنوں میں فوقیت حاصل ہے کہ وہ برسہا برس سے موجودہ نظام کے خلاف تحریک چلاتی رہی ہے لیکن تب لوگ زندگی کی آسائشات میں اتنے مگن تھے کہ انہیں نہضۃ العلماء کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اب عام شخص یہ محسوس کر رہا ہے کہ ملک کو اگر بچانا ہے تو اس کی قیادت اسلام پسندوں کو سونپنی ہوگی۔

البتہ ملک میں ایک بڑا حلقہ مادی خوشحالی کے ساتھ ساتھ مغربی ثقافت سے بھی لطف اندوز ہونا چاہتا ہے اور ایسے لوگوں کو یقینا اسلام پسندوں کے مقابلے میں سابق صدر سوکارنو کی بیٹی زیادہ پسند آئیں گی۔ پھر جو بیرونی طاقتیں انڈونیشیا میں تبدیلی اقتدار کے مسئلے پر غور کر رہی ہیں وہ بھی یہی چاہتی ہیں کہ صدر سوہارتو کے جانے کے بعد ملک میں کوئی ایسی قیادت سامنے نہ آئے جس سے مغرب کے مفادات کو خطرہ ہو لہذا امریکہ اور اس کے حلیف امریکی ممالک اور عالمی مالیاتی اداروں کی یہی خواہش ہوگی کہ سوہارتو کے بعد اقتدار کی منتقلی ایک ایسے گروہ کے ہاتھوں میں ہو جو نئے انڈونیشیا میں اسلام پسندوں کے خطرے کا مقابلہ بھی کر سکیں اور جب تک کوئی ایسی قیادت سامنے نہیں آتی مغرب اس بات کی پوری کوشش کرے گا کہ سوہارتو کے دور اقتدار کو طول دیا جائے۔ اس وقت بغاوت کی تحریک پر بڑی حد تک مسلم انقلابیوں کا قبضہ ہے۔ بیشتر تعلیمی اداروں میں تحریک کا کمان اسلام پسندوں کے ہاتھوں میں ہے جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پورا ملک سوہارتو کے جبر سے تنگ آکر اسلام پسندوں کی قیادت میں مستقبل کا سفر طے کرنا چاہتا ہے۔ تشدد کے واقعات ہوں یا چینی تاجروں پر حملے، ہر جگہ توڑ پھوڑ کے ہنگامے میں اسلام کا نام لیا جارہا ہے۔ یقینا اس عوامی تحریک میں بہت سے واقعات ایسے بھی ہوئے ہیں جو خود اسلام پسند قیادت کو ناگوار گزرے ہیں لیکن مجموعی طور پر ہر سطح پر اسلامی نعروں سے کام چلایا جارہا ہے۔ بعض دانشور اس خیال کا اظہار بھی کر رہے ہیں کہ اگر سوہارتو کو رخصت کرنا ہے تو اسلام پسندوں اور دیگر اپوزیشن پارٹیوں کو متحد ہونا پڑے گا۔ یہ بات تو تقریبا طے پا چکی ہے کہ صدر سوہارتو کے لئے اب انڈونیشیا میں زمین تنگ ہوتی جائے گی اور یہ کہ ان کا جانا طے پا گیا ہے البتہ اس انقلاب کے بطن سے ایک اسلامی انڈونیشیا پیدا ہوگا یا نہیں، اس کا انحصار بڑی حد تک اسلام پسندوں کی سیاسی بصیرت پر ہوگا۔ اس لئے کہ اگر انہوں نے موجودہ صورت حال پر اپنی گرفت مضبوط نہ رکھی تو اس بات کا خاصا امکان ہے کہ انڈونیشیا میں سوہارتو کے بعد کوئی دوسرا جابر برسر اقتدار آجائے۔ ▭

بقیہ: ذکر نیوکلیائی دھماکوں کا...

پڑنے سے ہر سال سینکڑوں افراد لقمہ اجل بن جاتے ہیں جہاں مذہبی مقامات کو مسمار کیا جاتا ہو، جہاں فرقہ وارانہ فسادات بھڑکا کر نہتے مظلوم انسانوں کی نسل کشی کی جاتی ہو، جہاں معصوم نوجوانوں کو اپنے بہنوں کی حفاظت کی پاداش میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل دیا جاتا ہو بھلا ایسے ملک میں محض ایک جوہری دھماکہ پر مجھے فرقیوں ہو۔ دھماکہ تو مجھے ایک دھوکہ لگتا ہے، ایک سراب محسوس ہوتا ہے۔ یہ ان کروڑوں ہندوستانیوں کے ساتھ ایک مذاق ہے جنہیں نہ تو اپنے ہندستانی ہونے پر فخر ہے اور نہ کسی سے شکوہ ہے۔ ان بے چاروں کو، ان سادہ لوحوں کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ملکی وسائل کس طرح ذاتی انا کی تسکین کے لئے لٹائے جا رہے ہیں۔ ہاں ان کی آنکھوں میں ایک انتظار ضرور ہے کسی ایسے مسیحا کی آمد کا جو انہیں ان جابر اور ظالم سیاست دانوں سے نجات دلا سکے۔ ان کی خاموش زبانیں ہندستان میں ایک نئے انقلاب کی آمد کا اعلان کر رہی ہے۔

جانکنی کے اس عالم میں اور قیامت کی اس گھڑی میں ہمارا دل ان کروڑوں ہندستانیوں کے ساتھ ہے جن کا مستقبل ظلم و جبر کی تاریک راہوں میں کھوگیا ہے، جن کے خواب کی تعبیر کو ظلم و جبر کے علمبرداروں نے اپنے آہنی قید خانوں میں قید کرلیا ہے، جن کی آرزوؤں اور امنگوں کا خون ہوا ہے جن کے چہروں سے خوشیاں چھین لی گئی ہیں۔ کاش کہ کوئی انہیں جنونی اور ظالم سیاست دانوں کے جبر سے نجات دلا پاتا۔ ▭

ہندوستانی مسلمان

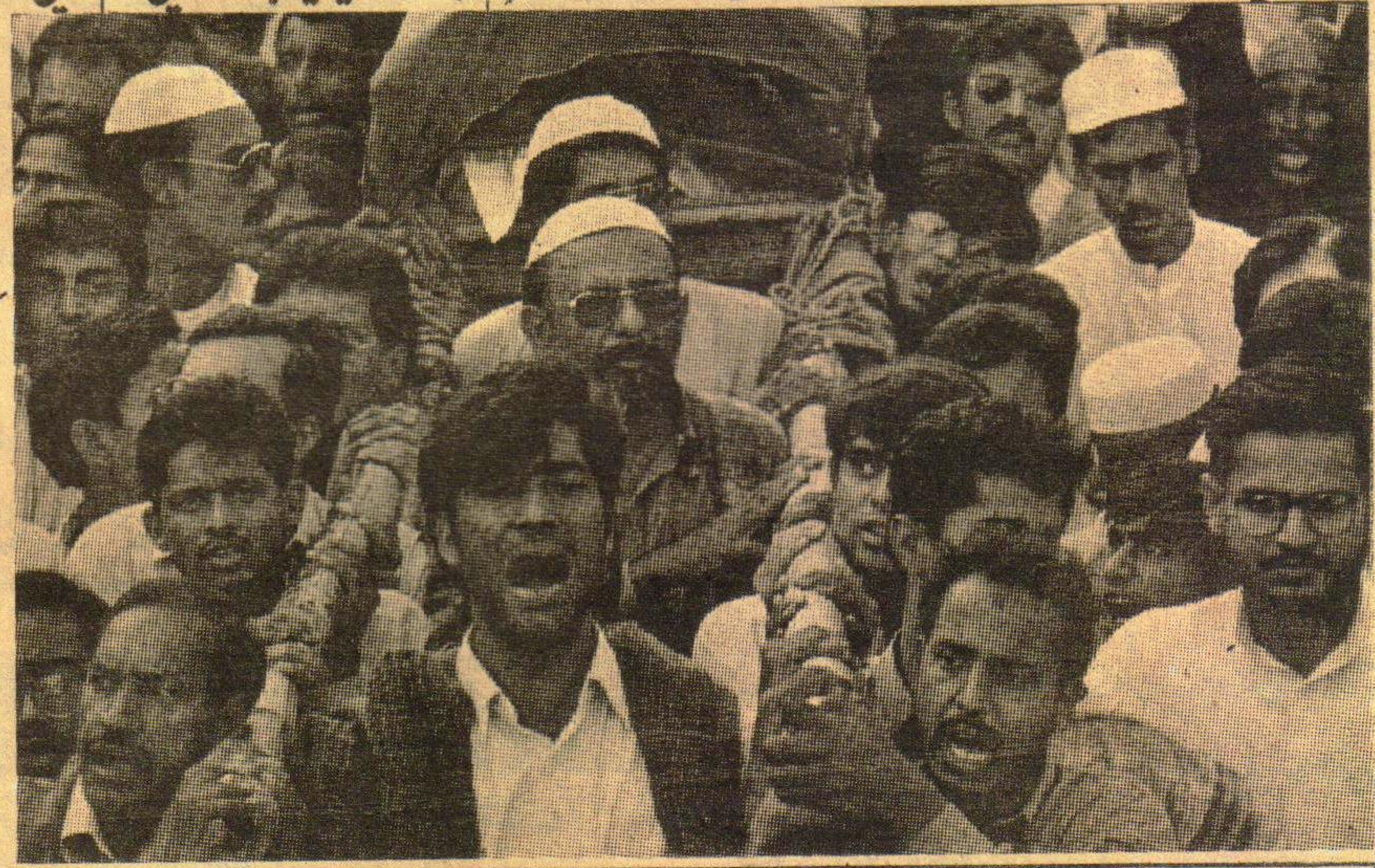
ترس گئے ہیں کسی مرد راہ داں کے لئے

تحریر: سرتاج علی خاں ایڈووکیٹ

(رکن ملی پارلیامنٹ)

افسوس ہم ایک ایسی ساعت میں امت کا محاسبہ کرنے بیٹھے ہیں جب دلی کی کرسی پر شہادت بابری مسجد کے مجرم بالاخر متمکن ہوگئے۔ اگر ہندوستانی مسلمانوں کے سلسلے سے گذشتہ تین سو سالوں کا جائزہ لیا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ ہمارے ملک میں اسلام کی اسپرٹ بجھتے چراغ کی طرح سسک سسک کر دم توڑتی رہی اور ہم نے دانستہ یا نادانستہ طور پر کبھی مسلکی مناظروں میں جوش ایمان کو صرف کیا تو کبھی خانقاہوں میں محصور ہونے ہی میں عافیت سمجھی۔

آزاد ہندوستان کی پچاس سالہ تاریخ مسلمانان ہند کی بے بسی، قومی بے وقاری اور سیاسی بے وزنی کی طویل داستان ہے۔ اس ملک کو سیاسی شکنجہ میں جکڑ لینے کے لئے ارباب حل و عقد نے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کردینے کے تلخ گھونٹ کو بھی گوارہ کرلیا۔ کاش ملک تقسیم نہ ہوتا تو ہندوستان کی پارلیامنٹ میں 545 کے بجائے تقریبا 945 اراکین پارلیامنٹ ہوتے جس میں تقریبا نصف تعداد مسلمانوں کی ہوتی۔ راہ فرار کو ہجرت کا مقدس نام دینے والوں کو نہ مشرق میں پناہ ملی نہ مغرب میں اور نصف صدی کی طویل مدت بھی انہیں مہاجر سے مقامی نہ بنا سکی۔ ہندوستان سے وابستگی نبھانے والے لوگ ہر چند کہ اپنے وطن کی مٹی سے جڑے رہے لیکن تقسیم کے سانحہ نے ان کے اکابر کو سکتے میں ڈال دیا۔ ان کے نوجوانوں کو ناکردہ گناہ مجرم کی حیثیت سے سہمے سہمے سے جیتے رہنے پر مجبور کردیا۔ پھر فسادات کا لامتناہی سلسلہ حکومت اور فسطائی قوتوں کے ذریعہ ہر لمحہ نت نئے ایشوز کھڑا کرکے ان کی تمام تر توجہ ترقیاتی منصوبوں سے ہٹاکر خوف و دہشت کے ماحول میں بے چارگی و بے بسی کے دائمی احساس کے ساتھ جیتے رہنے پر مجبور کیا۔ دوسری جانب اردو، علی گڈھ، شیلا پوجن، رتھ یاترا، اجودھیا، کاشی، متھرا، کامن سول کوڈ، آرٹیکل 370 وغیرہ جیسے مسائل کے ذریعہ قومی بے وقاری کا احساس بھی دلوں میں جاگزیں کردیا گیا تو دوسری طرف سیاسی بے وزنی کو دائمی رنگ دینے کے لئے 545 پارلیمانی نشستوں میں تقریباً 120 پارلیمانی نشستوں کو مسلمانوں کے لئے حرام قرار دے دیا گیا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ 120 پارلیمانی نشستوں میں بیشتر وہ سیٹیں ہی منتخب کی گئیں جہاں مسلمانوں کی آبادی فیصلہ کن اہمیت کی حامل تھی۔ اسی پیمانہ پر اسمبلی کی نشستوں کی تقدیر کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ یہ بھیانک سازش مسلمانوں کو سیاسی قوت سے محروم رکھنے کے لئے ان لوگوں کے ذریعہ کی گئی جنہیں سیکولر کہتے ہماری اور آپ کی زبانیں نہیں سوکھتیں۔ اگر پیشہ یا تعلیمی و مالی پس ماندگی ہی پیمانہ تھی تو شیڈول کاسٹ کے ہم پیشہ یا انہیں کی طرح تعلیمی سماجی و مالی پس ماندگی میں جینے والے مسلمانوں کو وہی رعایت نہ دینا کس درجہ کی ناانصافی ہے۔ طرہ تو یہ ہے کہ اگر شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب کا فرد کرسچن، بودھ، سکھ یا کوئی اور مذہب قبول کرلیتا ہے تو اسے حاصل شدہ مراعات میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی لیکن جیسے ہی وہ مذہب اسلام کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ اس کی تمام سماجی تعلیمی اور مالی پس ماندگی کافور ہوجاتی



☆ ہائے بے چاروں کی قسمت: ہندوستانی مسلمان پچاس برسوں سے مردہ سیکولرازم کو کاندھا فراہم کرتے آرہے

سیکولرازم کے نام پر جب بھی غول بندی ہوئی تو مسلمانوں نے ہراول دستہ کا کام کیا۔ مسلمان چار دہائی سے اوپر ایک خاص سیاسی پارٹی کی حمایت کرتے رہے مگر انہیں تحفے میں جبل پور، بھیونڈی، علی گڑھ، نیلی، مراد آباد، میرٹھ، ہاشم پورہ، بھاگل پور، شیلا پوجن اور ۶ دسمبر ملا۔

ہے۔ تہہ در تہہ یہ بھی سازش تھی کہ جب مسلم نوجوان بیدار ہو کر ان ناانصافیوں کی طرف انگلی اٹھائے تو ان کا مقابلہ دلتوں سے ہو جائے اور ان دونوں کی سیاسی رقابت میں مکار اعلیٰ طبقہ کے رہنما سرپنچ کا رول ادا کریں۔ گذشتہ پچاس سالوں میں سیکولرازم کا سب سے زیادہ بوجھ ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے کندھوں پر ڈھویا ہے۔ سیکولرازم کی سڑی پر تعفن لاش اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھائے یہ قوم در در کی ٹھوکریں کھاتی رہی لیکن ہر جگہ اس کا استحصال ہوتا رہا۔ گذشتہ بارہویں پارلیمانی الکشن اور مرکزی حکومت سازی کے دوران سیکولر طاقتوں کی پالیسیوں اور بصیرت کا کھوکھلا پن ان کی خرید و فروخت، ان کی بے حیائی، ان کا ننگا پن دیکھ دیکھ کر مسلم ووٹر مایوسی کا بری طرح شکار ہو چکا ہے۔ سادگی مسلم کی دیکھ غیروں کی عیاری بھی دیکھ

سیکولرازم کے نام پر جب بھی غول بندی ہوئی تو مسلمانوں نے ہراول دستہ کا کام کیا۔ مسلمان چار دہائی سے اوپر ایک خاص سیاسی پارٹی کی حمایت کرتے رہے مگر انہیں تحفے میں جبل پور، بھیونڈی، علی گڈھ، نیلی، مراد آباد، میرٹھ، ہاشم پورہ، بہار شریف، بھاگل پور، شیلا پوجن اور 6 دسمبر ملا۔ جب وی پی سنگھ نے سیکولرازم اور دیش کی ایکتا کا نعرہ دیا تو مسلمان جوق در جوق ان کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ وہ بھول گئے کہ عین عید کے دن مراد آباد کے سانحہ کے وقت یہی وی پی سنگھ یوپی کے وزیر اعلیٰ تھے۔ وزارت عظمیٰ کی کرسی سنبھالنے کے بعد انہوں نے پہلا عظیم کام یہ کیا کہ بدنام زمانہ جگ موہن کو کشمیر کا گورنر متعین کیا جس نے وادی گلپوش کو وادی کفن پوش میں تبدیل کر دیا۔ اس نے کشمیری مسلمانوں کی نفسیات پر اتنے گہرے زخم لگائے کہ سارا کشمیر نفسیاتی طور پر ملک سے کٹ کر رہ گیا۔ وی پی سنگھ کی کوٹا فائل اور سیمی فائل کی پالیسیوں نے بھاجپا کو 2 ایم پی کی قلیل تعداد سے لے کر ملک کی وزارت عظمیٰ تک کے راستے کو ہموار کر دیا۔ لال کرشن اڈوانی کی رتھ یاترا جس نے پورے ہندوستان میں آتش گیر مادہ چھڑک دیا تھا۔ اس رتھ کو سومناتھ مندر کے دروازے پر ہری جھنڈی دکھانے والا کوئی اور نہیں یہی وی پی سنگھ تھے۔

دامن پہ کہیں چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

اسے سیکولرازم کا مخول کہیں یا بساط سیاست کی "شہ" کہ جس شخص نے ہندوستانی آئین کی دھجیاں اڑائیں آج وہی شخص ہندوستان کے داخلی امن و امان کا محافظ بنا بیٹھا ہے۔

شیشے کی عدالت ہے پتھر کی گواہی ہے
قاتل ہی محافظ ہے قاتل ہی سپاہی ہے

"بام سیف" والے کانشی رام نے دلت، پس ماندہ اور اقلیتوں کو بہوجن کے پیارے نام سے پکارا تو ان کی آواز پر لبیک کہنے والوں کے اگلی صف میں مسلمان نظر آئے۔ مگر کانشی رام کے نعرے کا ارتعاش ہوا کے دوش پر گونجنا ابھی بند بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ ملک کی سب سے بڑی فسطائی طاقت کی گود میں بیٹھ کر محب وطن مسلمان اور انصاف پسند ہندوستانی عوام کا منہ چڑانے لگے۔ کس کس کا نام لیا جائے۔ جارج فرنانڈیز، رام کرشن ہیگڑے، نتیش کمار، ممتا بنرجی، جے للیتا، چندرا بابو نائیڈو، کمار منگلم اور بوٹا سنگھ کل تک ان تمام لوگوں کے سیکولرازم کی قسمیں کھائی جاتی تھیں۔ آخر کیا ہو گیا کہ یہ تمام لوگ پکے ہوئے آم کی طرح بھاجپا کی گود میں ٹپک پڑے۔ سماجی انصاف کے دعویدار اور ایم وائی کے چیمپئن لالو پرساد نے بھاگل پور قتل عام کے سرپرست جی پی دوسرے کا گریبان پکڑنے کے بجائے اسے ڈی جی پی بنا دیا۔ بھاگلپور فساد کے سپہ سالار کامیشور یادو کو اکرام خسروانہ سے نوازا۔

بیالیس برسوں تک کانگریس مسلمانوں کو جن سنگھ اور بی جے پی کے نام سے ڈراتی رہی۔ وہی بہار میں پچھلے آٹھ سالوں سے لالو جی اور ان کے ڈھنڈورچی کر رہے ہیں۔ یہ سلسلہ ہر وہ طاقت جاری رکھے گی جو برسر اقتدار ہونا چاہے گی۔ چونکہ حکمرانوں کا مزاج یہی ہے اور ہمارے اور آپ کے بیچ کے دلال اپنے آقاؤں کو مسلمانوں کا خیر خواہ ثابت کرنے کے لئے زمین و آسمان کے قلابے ملاتے رہیں گے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ترکستان اور ایران کے میدانوں میں تاتاریوں نے پچاس لاکھ مسلمانوں کو تہہ تیغ کر دیا۔ بستی اور شہروں کو ویران کر دیا تو ہلاکو خاں کے مسلمان دلالوں نے فتوی بانٹا کہ تاتاریوں کو زمین کے بڑے حصے پر حکمرانی حاصل ہے اس لئے ان کی اطاعت اولی الامر ہے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ نہ حکمرانوں کے تیور بدلے ہیں نہ دلالوں کی ملت فروشی بدلی ہے نہ ظلم کے انداز بدلے ہیں نہ آنسو کی سوزش، نہ مظلوم کی آہ کا دھواں بدلا ہے نہ خون کے رنگ، نہ قدرت کا اصول بدلا ہے۔ لاغالب الا اللہ۔ نصف صدی کی جھلسا دینے والی سیاسی فضاء نے مسلمانوں کو بے آب و گیاہ ریگستان میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ گھپ اندھیری رات ہے اور یہ قافلہ سمت کھو چکا ہے۔ ایسے میں رہزنوں اور لٹیروں سے لٹ جانا کیا تعجب؟

نصف صدی کی جھلسا دینے والی سیاسی فضاء نے مسلمانوں کو بے آب و گیاہ ریگستان میں لا کھڑا کر دیا ہے۔ گھپ اندھیری رات ہے اور یہ قافلہ سمت کھو چکا ہے۔ ایسے میں رہزنوں اور لٹیروں سے لٹ جانا کیا تعجب؟

نشان راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مرد راہ داں کے لئے

پوری قوم سیاسی بندھک کی سی کیفیت سے دوچار ہے۔ اس تعطل کو ہر حال میں توڑنا ہوگا۔ اس دلدل سے ہر حال میں نکلنا ہوگا۔ ہندوستان کے تقریباً 5 لاکھ گاؤں میں بسا ہوا مسلمان اپنے تحفظ اپنی بقا کا سوالی ہے۔ اس سوال میں اس کی آنے والی نسلوں کا مستقبل مضمر ہے۔ وہ ہندوستان کے باوقار شہری کی زندگی جینا چاہتا ہے۔ وہ کسی کے خوف یا کسی کے ذریعہ اس خوف کو دور کردینے کے کھوکھلے دعوے کی کیفیت کے بیچ اب اور زیادہ عرصہ گھٹ گھٹ کر جینا نہیں چاہتا ہے۔ وہ سماجی بے وقاری کے خلاف جدوجہد کرنے کو بالکل تیار ہے مگر اس سے قبل ان اسباب کی تلاش ضروری ہے جن کے نتیجے میں ملت اسے خسران سے دوچار ہوئی ہے اور بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس دن سے اس امت کے ہاتھ سے امارت کی کنجی چھین کر خلیج باسفورس کے گہرے سمندر میں پھینک دی گئی اس دن کی مخوصیت نے قوم کے جہاز رانوں سے سمت نما چھین لیا۔

ملت کی سیاسی بے سمتی کا نسخہ کیمیا ایک الگ خطہ زمین کا مطالبہ تو ہرگز نہیں ہے۔ نصف صدی قبل کا تجربہ گاؤں گاؤں قریہ قریہ میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے حق میں ہرگز نہیں تھا۔ اس کا حل یہ بھی نہیں ہے کہ ملک کو بدامنی کے راہ پر گامزن ہونے کی اجازت دے دی جائے۔ اس کا حل یہ ہے کہ امت کی سیاسی صف بندی کی جائے اور مختلف سطح پر مضبوط نٹ ورک تشکیل دیا جائے۔ یہ نٹ ورک جتنا مضبوط، جتنا مربوط اور جتنا وسیع ہوگا اسی مناسبت سے ملت کی حصہ داری محفوظ ہوگی۔ ملک کی سیاسی عنان ملت کے اشاروں کی رہین منت ہوگی۔ حکومت میں مسلمانوں کی متناسب نمائندگی کا معاملہ ہو یا مسلم آبادی والے علاقوں سے ریزرویشن کو دیگر علاقوں میں منتقل کرنے کا معاملہ ہو۔ ہمارے اتحاد کی حکمت عملی کے ذریعہ سب کچھ ممکن ہے جو آج ناممکن یا بعید محال نظر آتا ہے۔ ہماری متحدہ قوت جس حد تک کسی کو بنانے یا بگاڑنے کی پوزیشن میں ہوگی اسی حد تک ہماری سیاسی حصہ داری بھی پکی ہوگی۔ اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ ساٹھ ستر فیصد مسلم آبادی والے علاقے سے مسلم دشمن جماعتیں کامیاب ہوجاتی ہیں۔ چونکہ وہاں مسلم امیدواروں کی ایک پوری فوج کھڑی ہوجاتی ہے جس کے نتیجے میں مسلم ووٹ بکھراؤ کا شکار ہوجاتا ہے لیکن ایک مضبوط تنظیمی ڈھانچہ کی موجودگی میں کامیابی صرف اسی کا مقدر ہوگی جس کی حمایت ملی تنظیم کرے گی۔ صوبہ بہار میں تقریباً سات پارلیمانی حلقہ ایسے ہیں جہاں مسلمان اپنے دم خم پر پارلیامنٹ میں پہنچ سکتا ہے اور پانچ ایسی پارلیمانی نشستیں ہیں جہاں کسی نہ کسی کے ساتھ معاہدہ کرکے نشست حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس طرح بہار کی 324 اسمبلی نشستوں میں تقریباً 77 ایسی نشستیں ہیں جہاں مسلم نمائندے تھوڑی سی حکمت عملی سے کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔ یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ کوئی بھی سیاسی پارٹی کسی مسلمان کو کسی ایسے حلقہ سے کامیاب نہیں کراسکتی جہاں مسلم ووٹ فیصد کن اہمیت کا حامل نہیں ہے تو پھر ایسے مسلم امیدوار کو اپنا قیمتی ووٹ دے کر کیوں ضائع کیا جائے جو پارلیامنٹ یا اسمبلی کی بلندیوں تک مسلمانوں کے گردے پر پاؤں رکھ کر پہنچتا ہے لیکن حق نمک صرف اپنے سیاسی آقا کا ادا کرتا ہے۔ اسے مسلم عوام کے مسائل ان کی پریشانی اور ان کے وقار کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ کانگریس ہو، جنتا دل کمیونسٹ ہو یا سماج وادی، راجد ہو یا بہوجن سماج پارٹی اس کا مسلم سیاستداں اپنی سیاسی پارٹیوں کی عینک سے مسلم مسائل کو دیکھتا ہے۔ وہ مسلم عوام کے احساس کی ترجمانی کرنے کی جرأت نہیں رکھتا۔ اتنی ساری نام نہاد سیکولر سیاسی پارٹیوں کی کھینچاتانی میں مسلمان بوکھلاکر مخبوط الحواس ہوگیا ہے۔ اب تو اونچی ترچھی ٹوپی اور جبہ و دستار والے علماء بھی کسی نرسمہاراؤ، کسی باجپئی، کسی لالو پرساد یا کسی ملائم سنگھ یہاں تک کہ رسوائے زمانہ لال کرشن اڈوانی کے دامن کو بوسہ دیتے نظر آرہے ہیں۔ یہ روباہ صفت علماء جو خود کو نائب رسول گردانتے ہیں اور دین اور عقیدے کا نام لے کر قوم مسلم کو تار تار کردینے سے بھی جب ان کا دل نہ بھرا تو اب وہ کرسی کے لئے آیت الکرسی بھی جپنے سے باز نہیں آئے۔



☆ بے بس مسلم خواتین آہ وبکا میں مصروف

الٰہی تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ سلطانی بھی عیاری ہے درویشی بھی ہے عیاری

ایسے سنگین حالات میں جمہور ملت کو جرأت مندانہ فیصلہ لے کر سیاسی دلالوں کو یکسر مسترد کرنا ہوگا اور متحد ہوکر شورائی جمہوریت کی اسلامی قدروں کا اعادہ کرنا ہوگا۔ آپ نے پچاس سالوں کے درمیان کتنے نااہلوں کو عنان حکومت سونپ دی۔ آپ کی طاقت نے ذروں کو ہمدوش ثریا کردیا۔ اللہ کے واسطے آنے والے کم ازکم پانچ سالوں کو اپنی شیرازہ بندی پر، اپنی سیاسی صف بندی پر صرف کرکے دیکھئے۔ ▭

ترقی پسند کون: اسلام یا مغرب

معروف بین الاقوامی دانشور علی مزروئی کے قلم سے اسلام اور مغرب کا ایک تقابلی مطالعہ

تلخیص و ترجمہ: س احمد

اہل مغرب اپنی مہذب اور روشن خیال سیکولر ڈیموکریسی کے مقابلے میں اسلامی معاشروں کو پس ماندہ، مذہب کا اسیر اور غیر انسانی اصولوں کا پابند سمجھتے ہیں۔ مغرب اور اسلام کے درمیان تہذیبی فاصلہ پیمائی کا عمل بہت مشکل ہے اور یہ فاصلہ اہل مغرب کے تصور سے خاصا کم ہے۔ اسلام جو صرف ایک مذہب ہی نہیں بلکہ تہذیب اور طرز حیات بھی ہے۔ مختلف مسلم ممالک میں فروعی فرق کے باوجود اسے ہر جگہ ایک ایسی مشترک قوت سے تحریک ملتی ہے جس کی بنیاد ایسے انسانی جذبے پر ہے جو اہل مغرب کے ادراک سے پرے ہے۔ اس کا احساس انہیں شاید ہی ہو کہ مغربی معاشرہ خود حریت پسندانہ اخلاقیات کی تقلید میں ناکام رہا ہے۔ مغرب اسلامی تہذیب کے جن پہلوؤں کو قرون وسطی کے نقوش سے تعبیر کر رہا ہے ہوسکتا ہے وہی پہلو ابھی کل تک مغرب کا طرہ امتیاز رہے ہوں اور کئی اعتبارات سے اسلامی معاشرے، سماجی اور تیکنیکی سطح پر ترقی یافتہ مغربی اقوام سے چند دہائی ہی پیچھے ہوں۔ بات گھوم پھر کر چونکہ وہیں پر آئی ہے کہ عام شہری کو زندگی کے اعلی اقدار و معیار تک رہنمائی کون سا راستہ کرتا ہے اور چونکہ مغرب کے پاس ہر سوال کا شافی جواب نہیں ملتا اس لیے اسلامی اقدار پر غور کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

مغرب میں گذشتہ چند صدیوں کی سائنسی اور تیکنیکی ترقیات کے ساتھ زندگی کی اقدار میں انقلابی تبدیلیاں آئی ہیں۔ قبل ازدواج جنسی تجربہ جو دوسری جنگ عظیم تک قانونا ممنوع تھا اب نہ صرف عام ہے بلکہ والدین کو بھی اس پر اعتراض نہیں ہوتا۔ اسی طرح برطانیہ میں مردوں کے درمیان ہم جنسی 1960ء کی دہائی تک جرم تھی اور آج نصف مغرب میں بالغ مردوں اور عورتوں کے درمیان ہم جنسی کو قانونی جواز حاصل ہوچکا ہے اور ہم جنسی مخالف قوانین کو انسانی حقوق کی پامالی سے تعبیر کیا جارہا ہے۔

خود مغربی دنیا کے اندر تہذیبی تفاوت کی مثالیں خاصی واضح ہیں۔ اگرچہ سزائے موت کا قانون پورے مغرب میں منسوخ کیا جاچکا تھا۔ امریکہ میں فی زمانہ سزائے موت کے واقعات میں اضافہ ہوتا جارہا ہے اور ہیومن رائٹس واچ، رومن کیتھولک چرچ اور دیگر تنظیموں کے احتجاج کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب سزائے موت کو امریکہ میں بھی انسانی حقوق کی پامالی قرار دے دیا جائے گا۔



عورتوں کی حیثیت اس سے برتے جانے والے صنفی امتیاز، حیا اور عفت مابی کے اسلامی اصولوں اور عوامی زندگی میں اس کی مشارکت پر پابندی اور اس میدان میں اس کی حاشیہ نشینی کے حوالے سے اہل مغرب مسلم معاشروں کو غیر روشن خیالی کا خاص طور سے طعنہ دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ برطانیہ میں عورتوں کو جائیداد پر مالکانہ حقوق کا اہل 1870 میں قرار دیا گیا ہے جب کہ مسلمان عورت کو یہ حق صدر اسلام میں ہی حاصل تھا۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں کسی عورت کو اپنے شوہر کے ساتھ تجارت میں شرکت کی اجازت ہے۔ جس وقت متعدد مغربی تہذیبیں اس اصول پر کاربند تھیں کہ جس خاندان میں بیٹے ہوں اس میں موجود بیٹیوں کو میراث میں کوئی حصہ نہ دیا جائے۔ اسلامی قانون نے بیٹے اور بیٹیوں دونوں کو ترکے میں حصہ دینے پر اصرار کیا۔ بیشتر مغربی ممالک میں عورتوں کو حق رائے دہندگی ابھی بیسویں صدی میں ملا

اسلام جو صرف ایک مذہب ہی نہیں بلکہ تہذیب اور طرز حیات بھی ہے۔ مختلف مسلم ممالک میں فروعی فرق کے باوجود اسے ہر جگہ ایک ایسی مشترک قوت سے تحریک ملتی ہے جس کی بنیاد ایسے انسانی جذبے پر ہے جو اہل مغرب کے ادراک سے پرے ہے۔

ہے اور 1971ء میں افغانستان، ایران، عراق اور پاکستان میں مسلمان عورتوں کو انتخابی عمل میں حصہ لیتے ہوئے دیکھ کر سوئزر لینڈ نے اپنے یہاں خواتین کو رائے دہندگی کا حق دیا ہے۔ مزید یہ کہ وسیع ترین اور بااثر ترین ملک امریکہ میں صدارت کا عہدہ اب تک کسی عورت کو نہیں ملا اس کے برعکس دو کثیر ترین آبادی والے ممالک پاکستان اور بنگلہ دیش اور ترکی میں خواتین وزارت عظمیٰ پر فائز رہی ہیں۔

تقدیس کا تصور

سنسر شپ ایک ایسا موضوع ہے جس پر مغرب اور اسلام کے درمیان اختلاف اہل مغرب کے عام مفروضہ کے مقابلے میں کم گہرا ہے۔ گذشتہ دہائی کے معروف ترین واقعہ 1988ء میں سلمان رشدی کے ناول شیطانی آیات برطانیہ میں اشاعت ہے جس پر بیشتر ممالک میں پابندی عائد ہوگئی تھی لیکن جس نے مغربی منافقت سے پردہ اٹھادیا اور حقائق کی گہرائی میں جانے سے یہ اندازہ ہوا کہ مسلم معاشروں کے مقابلے میں دیگر معاملات میں مغرب میں سنسر شپ زیادہ سخت ہے۔ 1960ء تک لیڈی چٹر لیز لور کو مغرب اخلاقی ادب کی مثال اور آسکر وائلڈ کے ہم فسانہ رجحان کے منظر عام پر آنے تک The Picture of Dorian Gray کو بھی ناپسندیدہ اور مکروہ تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن رشدی کے قلم نے پیغمبر اسلام کی ازواج مطہرات کی حرمت و ناموس پر کیچڑ اچھالی تو مغربی دانشوروں نے یہ تاویل پیش کی کہ رشدی کو یہ مقدس حق حاصل تھا کہ وہ اپنی تحریروں میں سمند خیال کو بے لگام چھوڑ دے۔ بعض مقامات پر شیطانی آیات پر اس ڈر سے پابندی عائد کی گئی کہ فسادات پھوٹ پڑیں گے۔ ہندوستان میں اس پابندی کی وجہ یہ بتائی گئی کہ اس سے مذہبی جذبات بھڑکیں گے اور کشمیر میں پہلے سے جاری علیحدگی پسندی کو تقویت ملے گی۔ امریکہ میں انسدادی تدابیر کے قانونی معیاروں کے تحت منفی اثرات کے اندیشے کی بناء پر کچھ نہ کیا گیا لیکن ہندوستان کے انتباہ کے باوجود کتاب شائع ہوئی اور برطانیہ ہی نہیں بلکہ بمبئی، اسلام آباد، کراچی وغیرہ میں عوامی مظاہرے ہوئے جن میں جانی اور مالی نقصان بھی ہوا۔

رشدی کے معاملے کے برعکس اس کی بھی مثالیں ہیں کہ معروف مغربی ناشروں نے متنازع تحریروں کے مسودے مسترد کیے ہیں۔ 1996ء میں کیمبرج یونیورسٹی پریس نے یونان کی ریاست مقدونیہ میں نسل پرستی کے موضوع پر ایک سماجیاتی مطالعے پر مبنی Anastasia Karakasidou کی کتاب Filds of Wheat, Rivers of Blood کی اشاعت روک لی اور واضح طور پر وجہ یہ بتائی کہ یونان میں مذکورہ فرم کے ملازمین کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنسر شپ کے مقاصد، ذرائع اور طریقے مختلف ہوسکتے ہیں لیکن سنسر شپ مسلم دنیا کی طرح مغربی معاشروں میں بھی زندگی کی ایک کھلی حقیقت ہے۔ ایک میں سنسر شپ حکومتوں، ملاؤں اور اماموں کے ہاتھ میں ہے تو دوسری طرف اس کی باگ ڈور ثقافتی سرگرمیوں، اشتہاری فرموں، عوامی نشریاتی نظام کے منتظمین کے ہاتھ میں ہے یا اسکی حیثیت Decentralised سنسر شپ کی ہے۔

امریکہ میں قانون اور دستور سے آزادی تقریر کو اتنا خطرہ لاحق نہیں ہے جتنا اداروں سے اور پبلک براڈ کاسٹنگ سسٹم ان میں سر فہرست ہے۔ The Africans کے عنوان سے ٹیلی ویژن پر اپنے سلسلہ تقاریر میں ایک جگہ میں نے کارل مارکس کو آخری عظیم یہودی پیغمبر قرار دیا تو امریکی پروڈکشن اسٹیشن نے یہودی امریکنوں کی ناراضگی کے خوف سے مجھ سے تصنیفی اجازت حاصل کیے بغیر اس فقرے کو تقریر میں سے نکال دیا۔ دوسرا واقعہ یوں ہے کہ امریکی ٹی وی پر لیبیائی لیڈر کرنل معمر قذافی پر تین منٹ کی ایک سیریز پیش کرنی تھی جس میں مجھ سے مشورہ طلب کیا گیا تھا لیکن لیبیا کی طرف سے دہشت گردی کی مفروضہ سرپرستی کے پیش نظر اس سیریز میں زیادہ سے زیادہ منفی تاثر اجاگر کرنے کے لیے۔ اس کا طریقہ انہوں نے یہ سمجھایا کہ وہ تصویر جس میں قذافی اسپتال میں مریضوں سے ملاقات کررہے ہیں بدل کر اس کی جگہ دہشت گردوں کی بمباری سے تباہ شدہ روم ایرپورٹ کی تصویر لگادی جائے۔ میں نے اس سے اختلاف کیا اور اسپتال والی تصویر کی بحالی میں کامیاب رہا لیکن بمباری کی تصویر کے اضافے کو نہ روک سکا۔

Dcntralised Censorship کا میں خود ایک اور طرح بھی شکار ہوا ہوں۔ میری کتاب Cultural Force in World Politics پریس پہنچی تو مدیران نے

اہل مغرب مسلم معاشروں کو غیر روشن خیالی کا خاص طور سے طعنہ دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ برطانیہ میں عورتوں کو جائیداد پر مالکانہ حقوق کا اہل ۱۸۷۰ء میں قرار دیا گیا ہے جب کہ مسلمان عورت کو یہ حق صدر اسلام میں ہی حاصل تھا۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں کسی عورت کو اپنے شوہر کے ساتھ تجارت میں شرکت کی اجازت ہے۔

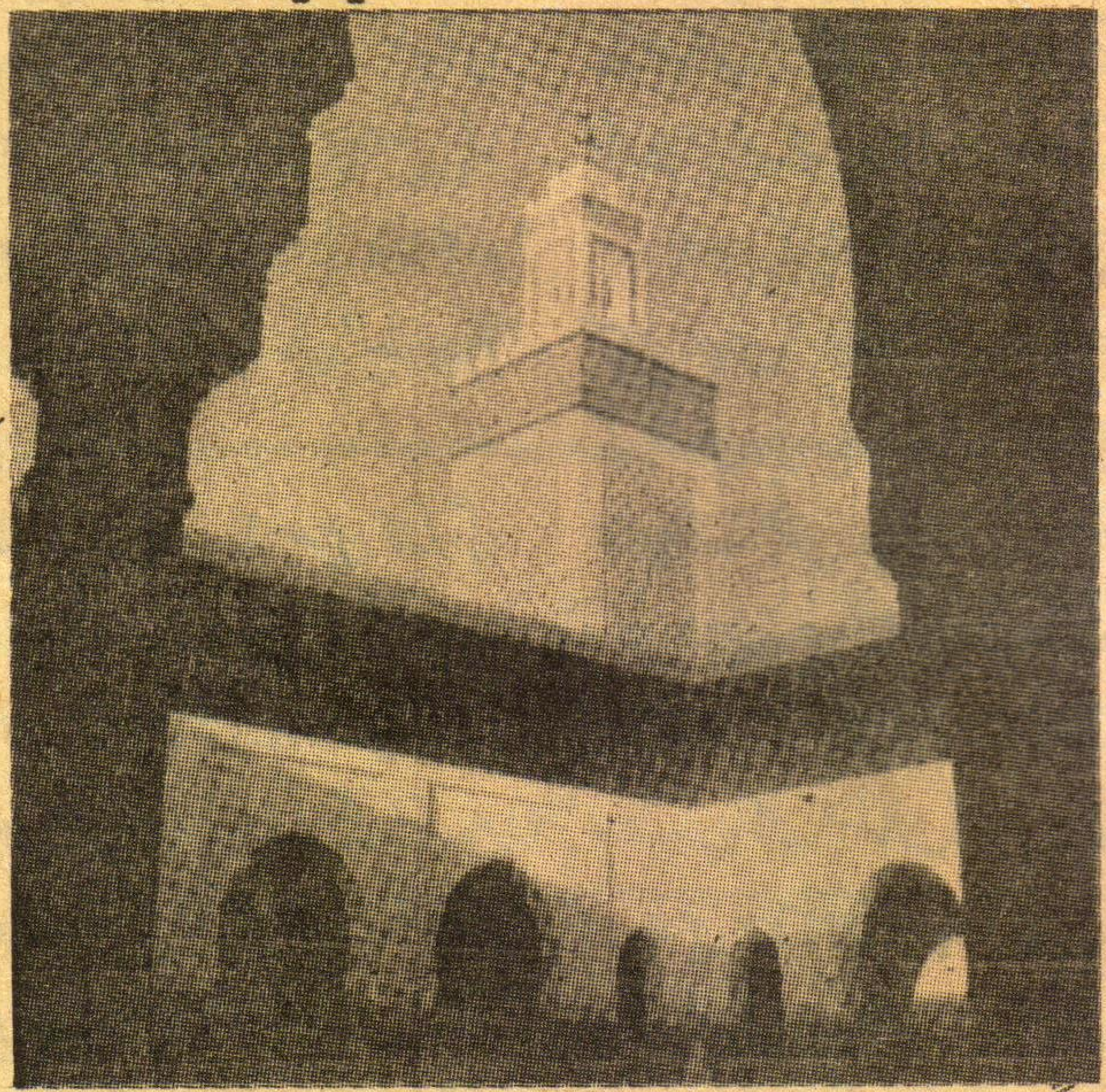
اس میں سے تین ابواب حذف کرنے کا مطالبہ کیا۔ پہلے باب میں میں نے شیطانی آیات پر تہذیبی سازش کے طور پر بحث کی تھی، دوسرے باب میں فلسطینی انتفاضہ تحریک کا موازنہ 1989ء چین کے تیانامن اسکوائر کے طلباء کی بغاوت سے اور جنوبی افریقہ میں نسلی تعصب کی بنیاد پر سفید فاموں اور سیاہ فاموں کے لیے الگ اصول کا موازنہ عربوں اور یہودیوں کے لئے علیحدہ ملک کے صیہونی اصول سے کیا تھا۔

دانشورانہ آزادی کا مرکز تصور کی جانے والی امریکی یونیورسٹیاں بھی سنسرشپ کی لعنت سے پاک نہیں ہیں۔ جہاں ملازمت میں توسیع کا انحصار مارکسزم کی ثناخوانی یا اسرائیل اور صیہونیت کی نکتہ چینی پر رہتا ہے۔

مذکورہ بالا مسائل میں سے بیشتر کا مذہب سے گہرا تعلق ہے۔ اہل مغرب کے خیال میں مسلم دنیا کی زیادہ تر خامیوں کا سبب اسلام ہے اور اسی لیے وہ اپنے طرز حکومت اور خود ساختہ ڈیموکریسی پر نازاں ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مذہب اور ریاست کے درمیان علیحدگی کے سوال پر اسلامی اور مغربی تہذیبوں میں کتنی دوری یا قربت ہے۔ 1531ء میں ہنری ہفتم کے قائم کردہ چرچ آف انگلینڈ سے اس مرکزی سوال کا جواب فراہم ہوتا ہے کہ مذہبی ریاست کا مظاہرہ ممکن ہے کیونکہ پہلے جمہوریت کو مضبوط کرکے اور پھر مذہبی ریاست کو کمزور کرکے انگریزی مذہبی ریاست کو جمہوری شکل دی گئی۔ اہم جمہوری تبدیلیاں انیسویں اور بیسویں صدی سے پہلے ممکن نہ ہو سکیں جب سماجی طبقات اور آخر میں خواتین کو حق رائے دہندگی دیا گیا۔ حال ہی میں اسلامی جمہوریہ ایران، مسلم شہنشاہوں اور اردن کے حریت پسندی کی طرف بڑھتے ہوئے قدم مذہبی ریاست کے نرم پڑنے کی مثال ہیں۔ یہاں تک کہ سعودی عرب اور چھوٹے خلیجی ممالک جمہوریت کی طرف رہنمائی کے طور پر شوریٰ کے اسلامی تصور سے استفادہ کر رہے ہیں۔

اقلیتی مذاہب کو تحفظ دینے کا مغربی وعدہ کبھی وفا نہ ہونے کی بدترین مثال سیکولر جرمنی میں ہالوکاسٹ کا المیہ ہے اور اس دور میں اس کے نقوش مشرقی یوروپ کی سامیت مخالفت تحریک اور فرانس کے مسلم مخالف رجحان میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

امریکہ میں دستور کے تحت مذہب اور سیاست دو صدی سے الگ الگ ہیں لیکن وہاں کی تاریخ میں صرف ایک بار کسی غیر پروٹسٹنٹ کو صدر منتخب کیا گیا۔ مختلف میدانوں میں امتیازی کارناموں کے باوجود کسی یہودی کو وہائٹ ہاؤس تک رسائی نہ مل سکی اور عیسائی بنیاد پرستوں کی طرف سے سامیت مخالفت کا خطرہ ہر وقت لگا رہتا۔ آج امریکہ میں یہودیوں سے زیادہ مسلمانوں کی آبادی ہے لیکن رائے دہندگان مسلم مخالف احساسات کے مدنظر یہ کبھی نہیں سوچا جاسکتا کہ کوئی مسلمان کبھی صدارت کے عہدے پر منتخب ہوگا۔ امریکی خاتون اول ہیلری کلنٹن کی طرف سے حال ہی میں عید کے موقع پر مسلم لیڈروں کی ضیافت کو وال اسٹریٹ جرنل میں ایک مضمون نگار نے وہائٹ ہاؤس میں حماس نوازوں کے داخلے سے تعبیر کیا۔ مغربی یوروپ میں لاکھوں کی تعداد میں مسلمان ہیں لیکن تاریخ آج بھی برطانیہ، فرانس اور جرمنی کی کابینہ میں کسی مسلمان کے داخلے کی منتظر ہے۔



دوسری طرف اسلام ہے جس نے عالم گیر پیمانے پر تاریخ کے ہر دور میں اقلیتی مذاہب کو تحفظ دینے کی کوشش کی ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو اس نے اہل کتاب کا درجہ دیا اور دیگر اقلیتوں کا ذمی کی حیثیت سے تحفظ کیا۔ مسلم اسپین میں یہودی علماء کی پذیرائی ہوئی۔ سلطنت عثمانیہ میں عیسائیوں کو سرکاری عہدوں پر فائز کیا گیا۔ سلمان اول (1566-1520)، سلیم ثالث (1807-1789) کے عہد میں مغل سلطنت نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک متحدہ ہندوستانی ریاست کا حصہ بنایا۔ اکبر نے ہندوؤں کو حکومت میں لانے کی مغل پالیسی کو استحکام بخشا۔ نویں دہائی میں عیسائی طارق عزیز عراقی وزیر اعظم رہے۔ اقوام متحدہ کے سابق سکریٹری جنرل بطرس غالی جو کوپٹک عیسائی ہیں مصر کی وزارت خواجہ میں اعلیٰ عہدے پر رہے بغیر اس منصب پر نہ پہنچ سکے۔

95فیصد مسلم آبادی والی جنوبی افریقہ کی جمہوریہ سینغال میں دو دہائیوں تک رومن کیتھولک لیوپول سیدار سنگھور صدر مملکت رہے اور اس پورے عرصے میں عیسائی مخالف مظاہرے کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ان کے سیاسی حریفوں نے انھیں کسی بھی نام سے پکارا ہو لیکن کافر کبھی نہیں کہا۔ سینغال میں اقلیتوں کے تحفظ کے تئیں عالم گیر معیار سے وفاداری کا سلسلہ سنگھور کی جگہ ایک مسلمان صدر مملکت عبد الضیوف کے آجانے سے ختم نہیں ہوئی کیونکہ خاتون اول کیتھولک عقیدے کی ہیں۔ جس دن امریکی صدارتی امیدوار یہ کہنے کی جرات کہ میری بیوی شیعہ مسلم ہیں تو اسے اسی دن وہائٹ ہاؤس میں اپنے داخلے کے امکان کا خاتمہ سمجھ لینا چاہیے۔

اس تفصیل سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اہل مغرب اپنے سیاسی رویے میں اپنے دعوے سے کہیں کم سیکولر ہیں۔ دوسرے یہ کہ مسلم معاشرے اقلیتوں کے تئیں زیادہ عالم گیر معیار پر کاربند اور اپنے مغربی ناقدوں کے قیاس سے زیادہ متواضع اور منکسر المزاج رہے ہیں اور تیسرے یہ کہ مسلم معاشرے مذہبی اقلیتوں کو مغربی سیکولرزم کے دعویداروں سے کہیں زیادہ تحفظ فراہم کرتے رہے ہیں۔

بلندی اور پستی کے درمیان

ثقافت پیمائی کا معیار کسی معاشرے کے صرف اعلیٰ کارنامے ہی نہیں بلکہ اس کی وحشت و سفاکیت بھی ہے۔ بیسویں صدی میں اسلام بیشترڈیموکریسی اور اس کی نعمتوں کے لئے زرخیز ثابت نہیں ہوا ہے لیکن مسیحی، بدھی اور کنفیوشسی تہذیبوں کے برعکس وہ نازی ازم، فسطائیت اور اشتراکیت کا ہمدرد کبھی نہیں رہا۔ مسلم دنیا میں منظم فسطائیت اور بربریت کو عروج کبھی نہیں حاصل ہوا۔ حافظ الاسد اور صدام حسین پر بڑے پیمانے پر تشدد کا الزام ضرور لگایا جاتا ہے لیکن فسطائیت کو تشدد کا نظریہ بھی درکار ہوتا ہے جو شام اور عراق میں مفقود ہے۔

مسلمانوں کو اس لیے تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے کہ انھوں نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا مگر انھیں اس پر مبارکباد بھی دی جاتی ہے کہ انھوں نے دنیا کو ایسی اخلاقیات دی ہے جس کے ذریعے بدترین انجام سے بچا جاسکتا ہے۔ نازی پھانسی کیمپوں، امریکہ آسٹریلیا میں یوروپیوں کے ہاتھوں نسل کشی، پال پاٹ کے قتل عام کے میدان اور پنج سالہ منصوبے کے نام پر کروڑوں افراد کی فاقہ کشی اور بے گھری کی مثالیں مسلم دنیا میں نہیں ملیں گی۔ نہ ہی اس میں جنوبی افریقہ کا نسلی تعصب ہے جسے ڈچ ریفارمڈ چرچ نے جائز قرار دیا تھا، نہ 1945ء سے پہلے کی جاپانی نسل پرستی ہے اور نہ ہی امریکہ جیسی قدیم جنوب کی نسل پرست تہذیب ہے جس نے سیاہ فاموں کی ہلاکت اور ان پر ظلم و جبر روا رکھا تھا۔ اسلام نے نسلی تعصب کی ہمیشہ مخالفت کی ہے اور قومی اور نسلی امتیازات پر علم و فضل اور دیانت داری کو ترجیح دی ہے۔ مسیحی کلیسا کے برعکس مسجد نسلی تصبات سے پاک ہے۔ حضرت بلال حبشی غلام تھے۔ عربوں میں بین نسلی ازدواجی رشتوں کی حوصلہ شکنی کبھی نہیں کی گئی اور ان رشتوں سے پیدا ہونے والے بچوں کو ان کی ماؤں کی قومیت کے امتیاز کے بغیر عرب میں

دوسری طرف اسلام ہے جس نے عالم گیر پیمانے پر تاریخ کے ہر دور میں اقلیتی مذاہب کو تحفظ دینے کی کوشش کی ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو اس نے اہل کتاب کا درجہ دیا اور دیگر اقلیتوں کا ذمی کی حیثیت سے تحفظ کیا۔

اسلام نے مجاہدین پیدا کیے ہیں تو مغربی تہذیب نے ڈاکو پیدا کیے ہیں۔ افریقہ کا سب سے بڑا شہر قاہرہ ہے تو سب سے زیادہ مغرب زدہ شہر جوہانس برگ ہے قاہرہ میں جوہانس برگ کے مقابلے میں حد درجہ گنجان آبادی ہے اس کے باوجود جوہانس برگ کے تشدد کا پچاسواں حصہ بھی وہاں نہیں ہے۔ قاہرہ میں اس سکون کی وجہ کیا ہے۔ آج بھی بہت سے لوگوں کا ایمان ہے کہ اس کی وجہ اسلام ہے۔

سمجھا گیا۔ عربوں کی اس سماجی قدر نے دیگر مسلم معاشروں کو بھی متاثر کیا جیسا کہ اس سے ظاہر ہے کہ 1952ء کے انقلاب کے بعد سے مصر کے چار میں سے دو صدور مملکت یعنی محمد نجیب اور انور سادات کے اجداد سیاہ فام افریقی تھے۔

اسلام کے پاس منتخب زبان (عربی) کا اصول ہے نہ کہ منتخب قوم کا۔ 313 بعد مسیح میں رومن شہنشاہ کانسٹین ٹائن کی تبدیلی کے بعد مسیحیت کی قیادت یوروپیوں کے ہاتھ میں رہی ہے جب کہ مسلم دنیا میں یہ قیادت بنی امیہ سے لے کر خلافت عثمانیہ تک مغلوں سے فارس کے صفویوں تک متعدد بار تبدیل ہو چکی ہے جو اسلامی تہذیب میں مسیحیت کے مقابلے میں کہیں زیادہ نسلی مساوات کی غماز ہے کیونکہ اسلام نے اختلاط اور ارتباط کو ہمیشہ عزیز رکھا نہ کہ نسل کشی اور قتل عام کو۔

بے شک مسلمانوں کی تاریخ میں بڑے پیمانے پر انسانی ہلاکت کے واقعات ہوئے ہیں مثلاً 1915ء میں ترکی کی طرف سے پونے دو کروڑ آرمینیائی آبادی کا شام اور فلسطین کی طرف انخلاء جس میں دس لاکھ کے قریب افراد فاقے سے ہلاک ہو گئے یا مار ڈالے گئے تاہم کسی خطے سے آبادی کا انخلاء خواہ کتنا ہی مہلک کیوں نہ ثابت ہو نازی ہالو کاسٹ کی جگہ نہیں لے سکتا جس میں ساٹھ لاکھ جانیں ضائع ہوئیں۔ اس طرح 1947ء میں ہندوستان سے پاکستان منتقل ہونے والے مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔

کردوں کے خلاف صدام کی طرف سے زہریلی گیس کے استعمال کا نہ ہی ہالو کاسٹ سے موازنہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے کردوں کو نیس و نابود کرنے کے منظم منصوبے کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اسے خانہ جنگی میں استعمال ہونے والا ایک ناجائز ہتھیار ہی کہا جاسکتا ہے۔ اسلام نے زندیقوں کو آگ میں جھونکنے کی روایت کا کبھی اتباع نہیں کیا۔ سینکڑوں سال پہلے انسانوں کو آگ میں جلتے ہوئے دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجانے والے دوسرے عقائد سے وابستہ افراد کو گیس چیمبر میں گھٹ کر مرنے کے منظر کے متحمل ہو سکتے تھے۔ اس طرح کے بدترین گناہ کے ارتکاب پر اسلام نے ہمیشہ روک لگائی ہے۔

ہوسکتا ہے اسلام نے مغربی تہذیب سے زیادہ سیاسی تشدد کو جنم دیا ہے لیکن

مغربی تہذیب نے اسلام سے کہیں زیادہ اسٹریٹ وائلنس کی پیٹھ ٹھونکی ہے۔ اسلام نے مجاہدین پیدا کیے ہیں تو مغربی تہذیب نے ڈاکو پیدا کئے ہیں۔ افریقہ کا سب سے بڑا مسلم شہر قاہرہ ہے تو سب سے زیادہ مغرب زدہ شہر جوہانس برگ ہے قاہرہ میں جوہانسبرگ کے مقابلے میں حد درجہ گنجان آبادی ہے اس کے باوجود جوہانس برگ کے تشدد کا پچاسواں حصہ بھی وہاں نہیں ہے۔ قاہرہ میں اس سکون کی وجہ کیا ہے۔ آج بھی بہت سے لوگوں کا ایمان ہے کہ اس کی وجہ اسلام ہے۔

معیار زندگی کے پہلو سے اسلامی ریاست کی زیادتیوں کے زیر سایہ عوام حریت پسند ریاست کے مقابلے میں زیادہ عافیت سے ہیں۔ ایران میں لوگ بے خوف رہتے خاندانوں کے ساتھ گیارہ بجے رات تک پارکوں میں مل سکتے ہیں جب کہ وہاں سیاسی تشدد بھی رہا اور انقلاب بھی آیا۔ لیکن واشنگٹن اور نیویارک کے شہری کو اپنے ہی ہم وطن اور ہم شہر سے خطرہ لاحق رہتا ہے۔ آمریت اگر تہران کی محفوظ شہراہوں کا جواب ہو تو لاگوس تہران سے زیادہ پرسکون ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ اس مسئلے کا حل اخلاقیات میں ہے اور مسلمانوں کی قبل از جدیدیت ویسی اور روایتی ضابطوں کی طرف واپسی میں ہے۔ بیسویں صدی کی مہلک ترین سماجی لعنتوں یعنی ایڈز اور طوائف گردی کے مقابل اسلام ہی آیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسلم معاشروں میں ان کا تناسب بہت ہی کم ہے۔

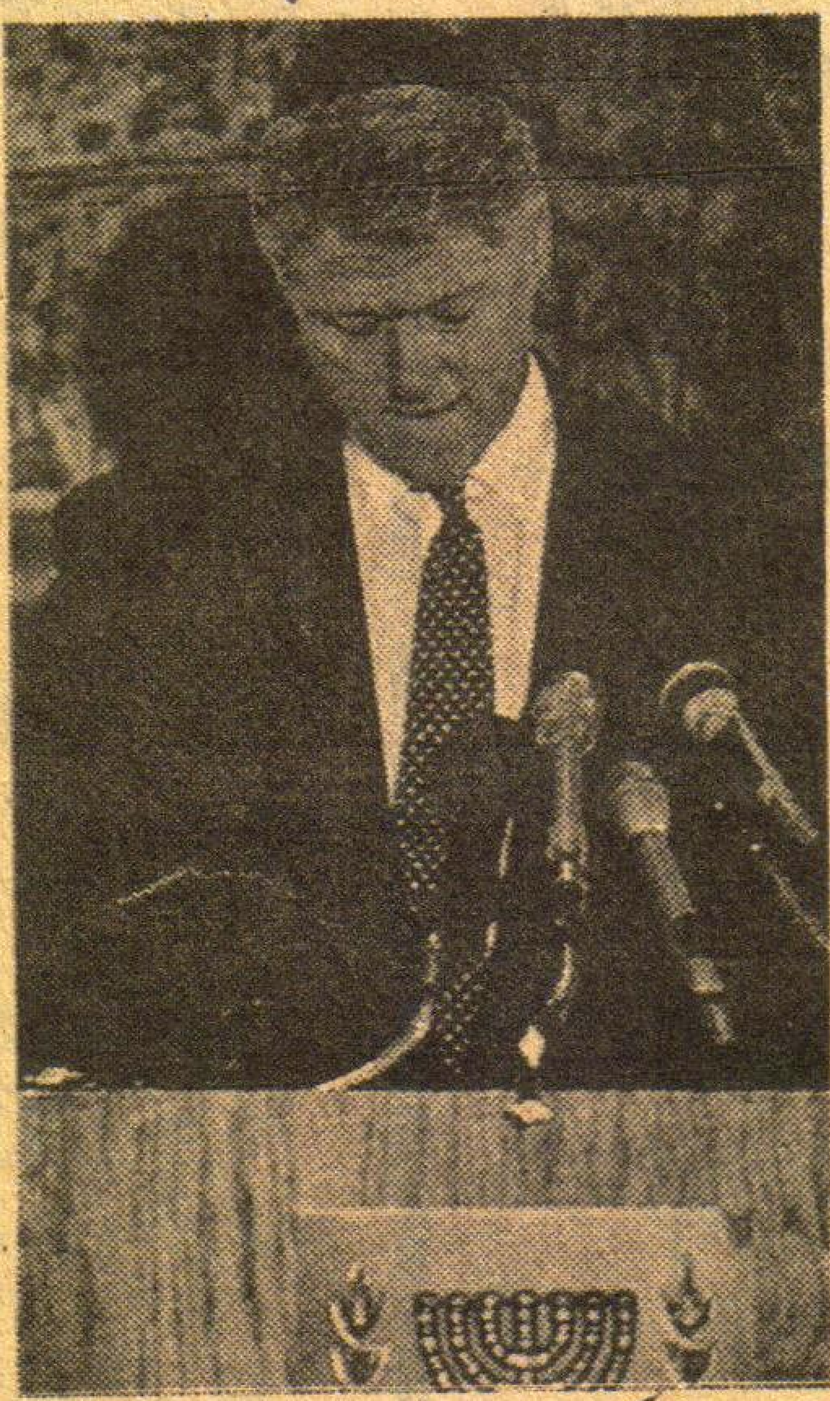
جہاں مغربی حریت پسندانہ ڈیموکریسی نے معاشروں کو عوامی مشارکت اور اقتصادی پیداواریت سے مستفید ہونے کے قابل بنایا ہے وہیں مغربی ثنویت، نسل پرستی، فسطائیت، استحصال پسندی اور نسل کشی کی پرورش گاہ بھی رہی ہے۔ جمہوری اصول اور انسانی اصول میں امتیاز برتنا ضروری ہے اور موخر الذکر میں مسلم دنیا مغرب سے آگے ہے۔

ڈیموکریسی بنیادی طور پر افراد کی طرف سے ایک حکمراں کی تلاش کا نظام ہے اور انسانی حکومت شہریوں سے معاملات کا ایک نظام ہے۔ اس اعتبار سے سلطنیت عثمانیہ انسانی طرز حکومت کی روشن مثال تھی۔ جمہوریہ ترکی، جمہوری اقدار کی جستجو کا دوسرا نام ہے۔ بیسویں صدی کے اختتامیہ پر شاید ترکی سلطنت عثمانیہ کی عظیم انسانی اقدار کو جمہوریہ عظیم ڈیموکریسی سے ہم آہنگ کرنے میں مصروف ہے۔

مغرب کو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ

دنیا کا مستقبل اس کے ہاتھوں سے پھسلتا جارہا ہے

سوویت یونین کے زوال کے بعد مغرب میں فتح کا ایک عام احساس پیدا ہوا تھا۔ مغربی مفکرین یہ سوچنے لگے تھے کہ دنیا کی سب سے بڑی عسکری قوت کو شکست دینے کے بعد اب آنے والے دنوں میں بلاشرکت غیرے دنیا کی قیادت پر ان کا کنٹرول ہوگا۔ یہ تعصب بھی عام تھا کہ کمیونزم کے زوال کے بعد اب دنیا میں صرف سرمایہ داری کو فروغ ہوگا اور یہ کہ مغربی سرمایہ داری جس کی قیادت امریکہ کر رہا ہے اسے کوئی چیلنج نہیں دیا جاسکے گا۔ 1991ء میں خلیج کی جنگ میں امریکہ اور اس کے حلیفوں کی کامیابی نے بھی اس بات کا اشارہ دیا تھا کہ مغرب اب پوری طرح دنیا کے سفید و سیاہ کا مالک بن گیا ہے۔ وہ جو کچھ کرنا چاہے کرے اب دنیا کی کوئی قوت اس کی راہ میں روڑہ نہیں بن سکتی۔ بوسنیا میں جو کچھ ہوتا رہا اسے آخری شکل اسی وقت مل سکی جب



مغربی قوت اس خطے میں امن کے لئے سنجیدہ ہوئی۔ اسی طرح آج دنیا میں جہاں جو کچھ مسئلہ درپیش ہے وہاں مغرب کی ثالثی کے بغیر کچھ کرنا ممکن نہیں۔ معاملہ خواہ فلسطین کا ہو یا کسی بھی ملک میں تنازع حل کرنا مقصود ہو۔ فی زمانہ امریکہ اور اس کے حلیفوں کی شمولیت کو ضروری خیال کیا جاتا ہے گویا دنیا پوری طرح مغربی پالیسی سازوں کے رحم و کرم پر ہے اور یہ صورت حال خلافت کے سقوط کے بعد سے اب تک جاری ہے۔

گذشتہ دنوں ایشیاء کے بعض ممالک میں تیز رفتار ترقی دیکھنے کو ملی۔ مسلم ملک ملیشیا میں صنعتی ترقی کی رفتار مغربی ممالک سے آگے نکل گئی۔ دیکھتے دیکھتے ملک میں فلک بوس عمارتوں کا جنگل سا اگ آیا۔ ملیشیا ہی نہیں قرب و جوار کے دوسرے ممالک میں بھی حیرت انگیز ترقی دیکھنے میں آئی۔ ایک لمحہ کے لئے ایسا لگنے

لگا جیسے آنے والے دنوں میں یہ علاقہ عالمی معیشت میں ایک اہم رول ادا کرے گا بلکہ بعض لوگ تو یہ تک کہنے لگے تھے کہ اکیسویں صدی میں صنعت و معیشت کی قیادت مغرب کی سرزمین سے یہاں منتقل ہوجائے گی لیکن نہ جانے اچانک کیا ہوا کہ ملیشیا، انڈونیشیا اور پڑوسی ممالک کی معیشت دیکھتے دیکھتے ہوا میں تحلیل ہوگئی۔ معاشی بحران اتنا سنگین ہوگیا کہ عام لوگوں کو روٹی روزی کے لالے پڑ گئے۔ گویا اس خطے سے مغرب کو جو خطرہ پیدا ہوچلا تھا اس کا بھی ازالہ ہوگیا۔ یقینا موجودہ صورت حال میں جب مغرب کو معاشی صنعتی اور سیاسی سطح پر چیلنج دینے والا کوئی نہیں ہے مغربی مفکرین کو اطمینان کا سانس لینا چاہئے لیکن ایسا نہیں ہے۔

مغرب کو اگر کوئی خطرہ ہے تو وہ خود اس کے اندرون سے اٹھ رہا ہے۔ دنیا کے سات بڑے شیاطین جنہیں G_7 ممالک کے نام سے جانا جاتا ہے آپس میں ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں اور اب چونکہ روس بھی اس کلب میں شامل ہونا چاہتا ہے اس لئے آنے والے دنوں میں G_7 کے اندرونی اختلافات میں مزید اضافہ ہوجائے گا۔ G_7 میں جو سات ممالک شامل ہیں ان کے نام یوں ہیں۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، جاپان، اٹلی اور کناڈا۔ اور اب روس کی شمولیت کے بعد ان ممالک کی تعداد آٹھ ہوگئی ہے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ جوں جوں دنیا پر مغرب کی اجارہ داری بڑھتی جارہی ہے مستقبل کے سلسلے میں مغربی پالیسی سازوں میں بے یقینی بڑھتی جارہی ہے۔ اب جب مغرب کے ہاتھوں میں دنیا کی چابی آگئی ہے اسے نہیں معلوم کہ دنیا کو کدھر لے جانا ہے؟ اس لئے کہ G_7 کی جو مجوزہ کانفرنس ابھی حال ہی میں برمنگھم میں منعقد ہوئی ہے اس میں مغربی ممالک کی بے بسی واضح طور پر محسوس کی گئی۔ مغرب نے جو دنیا بنائی ہے اس میں مسائل بے پناہ ہیں اور یہ سب کے سب اس کی اپنی پیدا کردہ ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں بے روزگاری بڑھتی جاتی ہے، سماجی اور نسلی مسائل نے شدت اختیار کرلی ہے۔ تیسری دنیا کو قرض دیتے دیتے مغرب پریشان ہے اور دنیا کے مختلف حصوں میں غربت و افلاس نے تہلکہ مچا رکھا ہے۔ دنیا کے موجودہ قائدین یعنی G_7 ممالک نے ان مسائل پر گفتگو تو کی اور انہیں اس بات کا شدت سے احساس بھی رہا کہ اگر ان مسائل کا حل نہ ڈھونڈا گیا تو ان کی بنائی ہوئی دنیا زیادہ دنوں تک نہیں چل پائے گی لیکن ان تمام حضرات کو اس بات کا بھی احساس رہا کہ یہ مسائل اتنے بڑے ہیں کہ وہ فی الواقع ان کے لئے زبانی خرچ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں کرسکتے۔

برمنگھم کے اجلاس میں G_7 ممالک نے بڑی خوبصورت باتیں کیں۔ دلنشیں انداز میں یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ مغرب ایک نئے معاشی نظام کے قیام کے لئے کوشاں ہے لیکن عملی طور پر اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا ممکن نہ ہوا۔ مغرب کو یہ بات سمجھ میں آنے لگی ہے کہ اس نے عالمی معیشت کا جو ڈھانچہ

دنیا کے موجودہ قائدین یعنی G_7 ممالک نے ان مسائل پر گفتگو تو کی اور انہیں اس بات کا شدت سے احساس بھی رہا کہ ان مسائل کا حل نہ ڈھونڈا گیا تو ان کی بنائی ہوئی دنیا زیادہ دنوں تک نہیں چل پائے گی

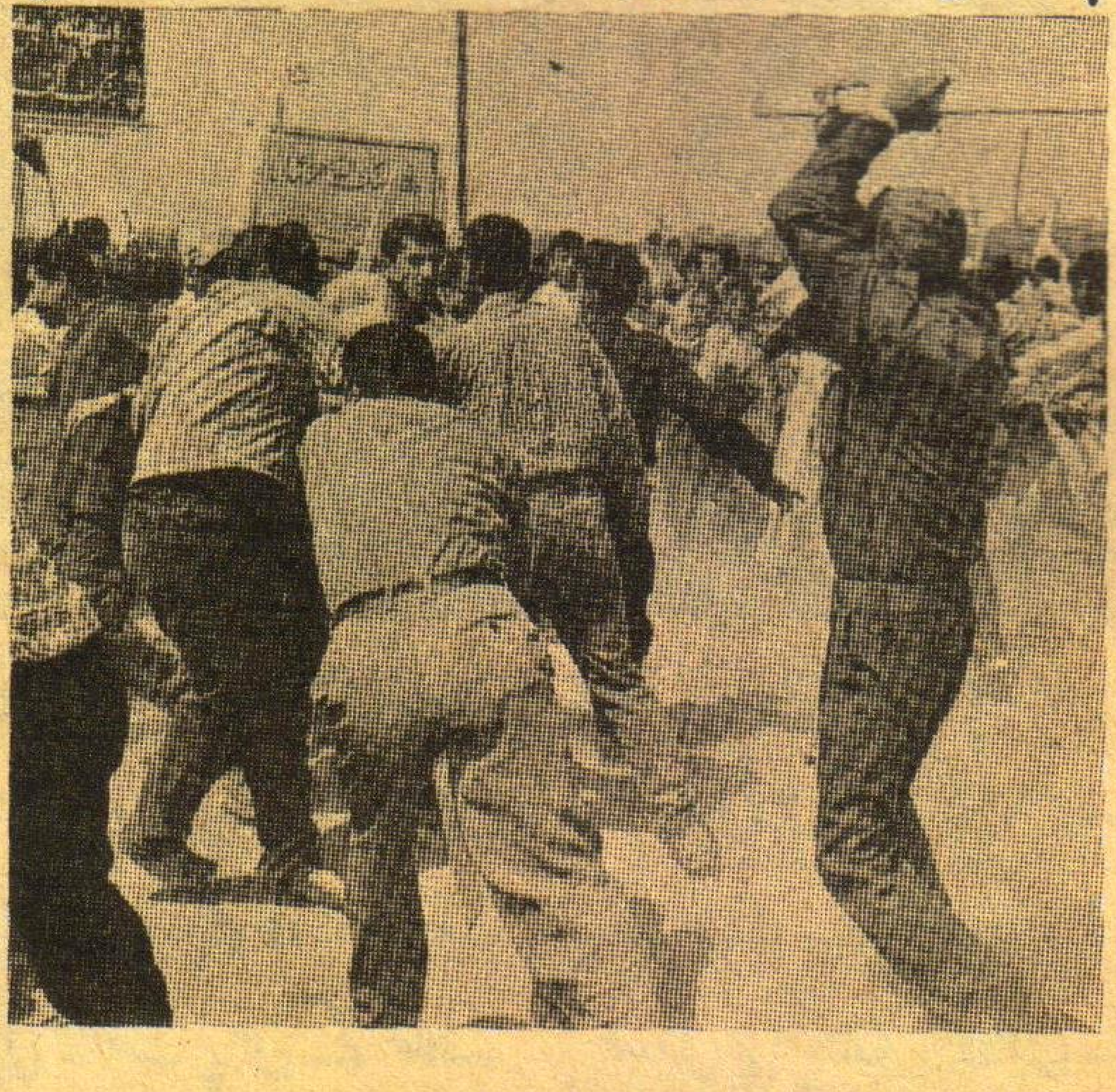
ترتیب دیا ہے وہ ناقص ہے۔ اس کی بنائی ہوئی دنیا میں خود اس کے اپنے پسندیدہ خوابوں کو بروئے کار لانا ممکن نہیں۔ جمہوریت، سیاسی آزادی، انسانی حقوق اس جیسی باتیں خواہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں واقعہ یہ ہے کہ خود مغرب کے اپنے معاشرے میں اسے رواج حاصل نہیں ہوسکا ہے اور یہ کہ جو لوگ ایک پرامن جمہوری دنیا کے مدعی ہیں وہ تشدد، زور زبردستی اور قتل و غارت گری کے ذریعے پرامن دنیا بنانا چاہتے ہیں اور اب جب انہیں اپنی پسند کی دنیا بنانے کا مکمل اختیار حاصل ہے انہیں ایسا لگتا ہے کہ سنہرے مستقبل کا راستہ موجودہ معاشی نظام کے اندر سے نہیں گزرتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے قائدین خوبصورت مستقبل کے بارے میں صرف گفتگو کرسکتے ہیں۔ ان بے چاروں کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آگے راستہ بند ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ آنے والے دنوں میں امریکہ، یورپ اور جاپان کو معاشی سبقت حاصل رہے گی اور یہ کہ دنیا کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ بڑی حد تک امریکہ کے ہاتھوں میں ہوگا البتہ دنیا کے موجودہ قائدین سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ آنے والے دنوں میں قیادت پر اسی طرح اپنی گرفت بنائے رکھیں گے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ مغرب کا بنایا ہوا معاشی نظام اب دنیا کو بہت آگے تک لے جانے کی پوزیشن میں نہیں ہے اور مستقبل کے سلسلے میں مغربی دانشوروں کے خواب دھندلے ہوتے جارہے ہیں اور ہر لمحہ انہیں ایسا لگتا ہے جیسے مستقبل ان کے ہاتھوں سے پھسلتا جارہا ہے۔ ▭

یہ کیا کم ہے کہ اسرائیل پچاس سال سے دنیا کے نقشے پر قائم ہے

ریاستِ اسرائیل کی پچاسویں برسی پر بین الاقوامی جریدے اکانومسٹ کے تبصرے پر مشتمل ایک معلوماتی رپورٹ

اسرائیل کے وجود کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر شادمانی کے اظہار کے طور پر نہ کہیں تقریب ہو رہی ہے نہ پٹاخے چھوٹ رہے ہیں۔ یہ بددلی اس وجہ سے اور بھی سمجھ میں آنے والی نہیں ہے کہ اسرائیل کو اس عرصے میں اپنے کارناموں اور پیش رفت پر فخر ہے خصوصاً اس لیے کہ اس کا باقی رہ جانا بذات خود ایک کارنامہ ہے۔ بھاری دفاعی اخراجات کے باوجود اس کے ہاں اتنی خوش حالی آئی ہے کہ مغربی ترقی یافتہ ممالک صف میں وہ کھڑا ہوا چاہتا ہے۔ وہ پہلی تین دہائیوں کے مقابلے میں جمہوریت پر زیادہ کاربند رہا ہے اور اس نے منتشر یہودیوں کو ان کے مقدس وطن میں جمع کر دینے کا صیہونی خواب پورا کیا ہے۔ سابق سوویت یونین سے سات لاکھ یہودیوں کی وہاں آمد کے بعد سے اسرائیل دنیا کے پندرہ ملین یہود میں سے ایک تہائی یہودیوں کا وطن ہے۔

مصر اور اردن سے امن معاہدوں کے ذریعے عداوت کی سنگین دیواروں میں چند روزن کھولنے میں کامیابی کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ اسرائیل نرغے میں رہا ہے۔ شام اور لبنان کے ساتھ سرحدی جھڑپیں اور تل ابیب اور یروشلم میں اسرائیلیوں کی جان و مال پر حملے اسرائیل کو اس کے عدم تحفظ کا احساس دلاتے رہے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ایران اور عراق اسرائیلی ریاست کو فنا کرنے کے درپے ہیں۔ سنگین خطرات کی زد پر رہ کر اسرائیل نے حوصلے بلند رکھے ہیں اور اگر کوئی کمی ہے تو بس مصیبت کی گھڑی میں اتحاد کے پرانے جذبے کی۔ پی ایل او سے پائیدار امن کا معاہدہ موجودہ حالات میں خاصی اہمیت رکھتا ہے جس کے لیے انہیں بعض ایسے ٹھوس فیصلے کرنے ہوں گے جو فلسطینیوں کی سخت گیری کی بناء پر اب تک ممکن نہ ہو سکے تھے۔ اس ضمن میں اسرائیلی مشرقی حدود کی نوعیت اور مغربی کنارے سے دست برداری کے سوال کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگی۔ یہ سوال اپنی جگہ پھر بھی قائم رہے گا کہ کیا سرحدی



معاہدے جنگ کے خطرے کا خاتمہ کر دیں گے۔

یہ ایسے سوالات ہیں جن کے جواب کی تلاش میں اسرائیل نے اپنے اندرونی اختلافات کو کھنگالا ہے اور 1967ء میں مغربی پٹی، مرتفع گولان اور غزہ پر قبضہ کے بعد ملک دو خیموں میں بٹ گیا تھا۔ لیبر پارٹی سرحدی سمجھوتے کے حق میں تھی تو لیکوڈ بلاک مقبوضہ علاقے کو اسرائیل کا حصہ بنانے پر مصر رہا۔

اسحاق رابن کے دور حکومت میں امن بندی کی طرف اسرائیل کے قدم اٹھے تھے اور ابھی واشنگٹن میں انہوں نے یاسر عرفات سے ہاتھ ملایا ہی تھا کہ ان کا قتل ہو گیا اور قاتل ایک اسرائیلی ہی تھا۔ رابن کے بعد اسرائیلی عوام نے سائمون پیریز سے کہیں زیادہ لیکوڈ کے غیر آزمودہ جوان لیڈر بن یامین نتن یاہو کا انتخاب کیا جنہوں نے فلسطینیوں سے کیے ہوئے معاہدہ اوسلو کو تقریباً غارت کر دیا اور رابن کے قاتل کا منشا بھی یہی تھا۔ امن کوششیں اگر آگے بڑھتی بھی ہیں تو ماضی کے زخم کھلے ہی رہیں۔ نتن یاہو پر رابن کی بیوہ اور ان کے حامیوں کا الزام ہے کہ انہوں نے ہی رابن کے قتل کی فضا تیار کی تھی تو دوسری طرف ایسا حلقہ بھی ہے جس کا دعویٰ ہے کہ رابن کے قاتل نے ثواب کا کام کیا ہے۔ اس طرح اسرائیلی سیاسی کلچر کا ایک تاریک پہلو دنیا کے سامنے آیا ہے۔

نامکمل امن، فلسطینی شہیدی دستوں اور اندرونی اختلافات نے چہروں سے شادمانی اور بشاشت چھین لی ہے۔ اس پژمردگی کے دو اسباب اور بھی ہیں۔ ایک کا تعلق ادھورے صیہونی کاروبار سے ہے تو دوسرے کی جڑیں صیہونیت کی کامیابی میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ قوم، ریاست، علاقے اور مذہب میں واضح طور پر رابطہ قائم کرنے کے کاروبار میں صیہونیت کو کبھی کامیابی نہ مل سکی۔ اس سے سب سے زیادہ خطرہ سیکولر آبادی کو لاحق ہے کیونکہ حالیہ چند دہائیوں میں شدت پسند عناصر کی تعداد، قوت اور اعتماد میں بے روک ٹوک اضافہ ہوا ہے۔ سیکولر اسرائیلی ان عناصر سے

اپنی آزادی اور طرز زندگی کو خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔ صہیونیت اور ربیت یعنی یکسا اور ریاست کے درمیان اس کشمکش سے اسرائیلی حکام کو عرب خطرے سے کہیں زیادہ تشویش لاحق ہے۔

صہیونیت اور بنیاد پرستی کی کشمکش تو سب پر عیاں تھی لیکن ایک اور مسئلہ جس کا سامنا اسرائیل کو ہے خود صہیونیت کی کامیابی ہے۔ اسرائیل کے وجود کے نصف اول میں ایک ریاست کے قیام، سرحدی دفاع اور جلاوطنوں کی یکجائی پر مشتمل صہیونی منصوبے نے قومی اتحاد و تعاون کے جذبے کو فروغ دیا لیکن آج کے تناظر میں صہیونیت کوئی مستحکم ارتباطی عنصر نہیں رہ گئی ہے۔ تشدد پسند صہیونیوں کو بھی اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ اس تحریک کی بہت سی اقدار جدید اسرائیل میں بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس تحریک کے بانی بن گورین نے اسرائیل کو سبزہ زار بنانے کا جو خواب دیکھا تھا وہ ہائی ٹیکنولوجی کے سائے میں پنپتی معیشت کی دھند میں دب گیا۔ صہیونیت نے اجتماعی زرعی فارم اور فرض شناس شہریوں کی فوج کا تصور دیا تھا لیکن بیشتر اسرائیلی آج افراد کی حیثیت سے عوامی آرزوؤں کی تکمیل کے بجائے ذاتی اغراض کی تکمیل کے لیے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔

صہیونی نظریے کی دھندلاہٹ نے اسرائیل کو ذہنی اور سماجی دونوں سطحوں پر متاثر کیا ہے۔ ایک صدی قبل اس نظریے کا مقصد ایک نئے طرز کے یہودی کی تعمیر تھی جو Diaspora کے بے معنی تجربے سے آزاد ہو۔ اس مقصد کے لیے ابتدائی صہیونیوں نے عبرانی زبان کا احیاء کیا۔ اپنے نام اسی زبان میں رکھے اور خود کو ایک نئی اسرائیلی شناخت سے آراستہ کرتے ہوئے مذہبی قدامت پرستی کے خلاف بغاوت کی۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہے کہ آج اسرائیلی پارلیمنٹ ان ممبران پر مشتمل ہے جو درجنوں مختلف ممالک میں پیدا ہوئے تھے۔

قومی تعمیر کا مقصد دیرپا ثابت نہیں ہوا اور جلد ہی یہ حقیقت کھلی کہ پرانی قوموں کی طرح اسرائیلیوں میں اپنی شناخت کے ماخذ سے وفاداری کا جذبہ پنپنے لگا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسرائیلی سیاست بھی امریکی سیاست کے خطوط پر چلنے لگی۔ اب وہاں کے عوام داہنے اور بائیں بازو سے ہی نہیں بلکہ روسی، مراقسی اشکنازی اور سفیرڈم کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ سابق سوویت روس سے اسرائیل پہنچنے والے یہودی جو سب سے بڑے نسلی گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے اپنے علاقے ہیں، الگ سیاست ہے۔ وہ اپنے روسی زبان کے اخبار پڑھتے ہیں اور ماسکو سے کیبل ٹی وی دیکھتے ہیں۔ ماضی میں اس طرح کی نسلی شناختوں کو قومی تعمیر اور خارجی خطرات سے دفاع کے حق میں دبا دیا جاتا تھا۔ اب یہ شناختیں ایک دوسرے کو مختلف پیچیدہ طریقوں سے کارٹ رہی ہیں۔ کبھی لیبر پارٹی اور لیکڈ بلاک کے قدیم اختلافات کی سطح پر، کہیں طبقاتی اور اقتصادی امتیاز کی سطح پر اور کہیں مذہبی اور سیکولر اختلافات کی سطح پر۔ یہ سب مل کر اسرائیلی سیاست کا چہرہ تبدیل کر رہی ہیں جن میں انفرادی اور گروہی مفادات کو استحکام مل رہا ہے تو پارٹی سے روایتی وفاداری کا پلڑا ہلکا پڑ رہا ہے۔

قبیلوں پر مشتمل قوم

دنیاء عرب سے آکر اسرائیل میں آباد ہونے والے اور فعال زندگی میں کامیاب سیفرڈم یہودیوں کے ساتھ اسرائیلی حکمرانوں کا برتاؤ خاصا حوصلہ شکن ہے جس کی مثال ہمیں فلم ڈائرکٹر وزان اور تل ابیب میں ایک میڈیا کمپنی کے منیجر کارن



کے تجربے سے ملتی ہے۔ وزان کے والدین نے مراقش سے اور کارف کے کے اجداد نے تیونس اور ایران سے اسرائیل کا رخ کیا تھا۔ ان کی پرورش عرب ماحول میں ہوئی۔ روایتی مذہبی تعلق نے اسرائیل کی طرف انہیں کھینچا نہ کہ صہیونی نظریات نے۔ اس ملک میں پورا نقشہ یوروپ کا تھا جہاں مشرقی یہودیوں کے لئے احترام اور لگاؤ مفقود تھا۔ اس تلخ تجربے نے ووٹوں کو ایک نئی سیاسی تحریک گیشیٹ (قوس قزح) کے نام چلانے پر مجبور کیا جس کا مقصد "یہ ملک ہمارا بھی ہے" کے نعرے کے تحت سیفرڈم یہودیوں کے مفادات کا تحفظ ہے۔ اعلی فوجی عہدوں پر اشکنازی یہودیوں کے تسلط اور ترقیاتی منصوبوں میں اشکنازی آبادی کے مفادات پر حکومت کی زیادہ توجہ سیفرڈم یہودیوں کو نکتہ چینی پر مزید اکساتی ہے۔ اسی طرح روس سے آنے والے یہودی بھی بہتر ملازمتوں سے لگ گئے اور انہوں نے اپنے علاقے بھی قائم کر لیے۔

اسرائیل کے ریاست کا درجہ پانے، مشترک تعلیم اور بین فرقی شادیوں کی شرح میں اضافے کے باوجود سیفرڈمی اور اشکنازی یہودیوں کے درمیان رشتوں کے حوالے سے آج بھی اسی طرح کے خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ سیفرڈم دراصل اسپین سے آئے ہوئے یہودی بلکہ اب اس کا اطلاق مشرقی وسطی اور شمالی افریقہ تک تارک وطن یہودیوں پر ہوتا ہے۔ سیفرڈم یہودیوں کے طبقے میں اختلافات تو ہیں ہی سیفرڈم اور اشکنازی یہودی آبادی کے درمیان کشمکش گہرے سیاسی اثرات

کا حامل ہے۔ اسرائیل بین الاقوامی تصادم کے نصف حصے کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اندرونی افتراق پر نظر نہیں جا پاتی اور اسی لیے بیرونی ممالک بھی اور لیکڈ پارٹی کے یک رخی تصادم کی روشنی میں اس کی سیاست کا جائزہ لیتے ہیں جس میں صرف سرحدی امور کو ہی اہمیت دی جاتی ہے اور سیفرڈم یہودیوں کے مسئلے کو یکسر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ نسلی اور سماجی گروہوں میں جو مسابقت اور چپقلش اندر ہی اندر جاری ہے وہ عربوں کو زمین واپس کرنے کے مسئلے کے محور پر گھومتی ہوئی "نارمل پالیٹکس" کی رو میں نظر نہیں آتی۔ اس ضمن میں 1977 کے انتخابات کی مثال دی جاسکتی ہے جب نیاچن بیگن سیفرڈی یہودیوں کے ووٹ کے بوتے پر برسراقتدار آئے اور اسرائیلی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد پہلی بار لیبر پارٹی کو سیاسی عہدے سے محروم ہونا پڑا۔ چونکہ بیگن مغربی کنارے کو اسرائیل میں ضم کرنے کے زبردست حامی تھے، اس انتخابات کے فلسطینیوں پر مہلک اثرات مرتب ہوئے حالانکہ بیگن نے ہی مرتفع سینائی سے فوجیں ہٹاکر مصر سے امن معاہدہ کیا تھا۔ تاہم 1977 کا انتخاب سرحدی بنیادوں پر نہیں بلکہ داخلی تبدیلیوں کی بنیاد پر لڑا گیا تھا۔ لیبر پارٹی کے یک جماعتی اقتدار کے تیس سال بعد اسرائیل کو اس تبدیلی کی ضرورت پیش آئی تھی اور سیفرڈم یہودیوں کو اپنی ضروریات کے لیے دیگر ذرائع تلاش کرنے تھے۔ اس دو جماعتی نظام میں کوئی بات اندازہ وقیاس سے باہر نہیں ہے۔ ایک کو سیاسی اور معاشی طور پر کمزور سیفرڈم طبقے کی حمایت حاصل ہے تو دوسری کو بارسوخ، خوشحال اور متمول اشکنازی یہودیوں کی، لیکن اس کی تہہ میں تین ایسے پیچیدہ امور ہیں جو اسرائیلی حکومت کے اضطراب کا باعث ہیں۔ سیفرڈم اور اشکنازیوں کے درمیان کشمکش کے علاوہ اسرائیل میں کئی طرح کے فرقہ وارانہ اور مذہبی تفرقے سر ابھار رہے ہیں، اس ملک کی آبادی تیزی سے مخلوط ہوتی جارہی ہے اور حال ہی میں تبدیل شدہ سیاسی نظام بھی خاصا تشویش کن ہے۔ 1970 میں جس طرح ڈیڑھ لاکھ روسی یہودیوں کا استقبال کیا گیا تھا وہی فراخدلی سوویت یونین ٹوٹنے کے بعد سات لاکھ روسی یہودیوں کے ساتھ بھی دکھائی گئی اس خیال سے کہ صیہونیت کا مزید استحکام لے گا لیکن انہوں نے اسرائیل کا چہرہ ہی بدل ڈالا۔ دو عام انتخابات پر وہ اثرانداز ہوئے اور اسرائیل میں اپنے قدم جمالینے کے بعد انہوں نے اسرائیلی معاشرے سے الگ تھلگ اجتماعیت کا ایک نیا احساس جگایا ہے۔ اس طرح اسرائیلی سیاست اشکنازی اور سیفرڈم یہودیوں کے درمیان مقابلہ آرائی سے ہی عبارت نہیں بلکہ روسی یہودیوں کی بھی ایک اقلیت وجود میں آچکی ہے جن کی اپنی سیاسی پارٹی بھی ہے اور اس کے ساتھ ہی ہریدی یہودی اور اسرائیلی عرب بھی اپنا وجود منوا چکے ہیں اور یہ دونوں بھی صیہونیت مخالف ہیں۔ ہریدی یہودیوں کی آبادی پورے اسرائیل میں پھیلی ہوئی ہے اور ان کی حیثیت دن بدن مستحکم ہوتی جارہی ہے جیسا کہ 1996 میں دو ہریدی پارٹیوں کے 23 سیٹوں پر قبضہ سے ظاہر ہے۔ ہریدیوں کی یہ پارلیمانی طاقت سیکولر اسرائیلیوں کی آنکھ میں کانٹا بن کر کھٹک رہی ہے۔ کیبنٹ میں ہریدی ممبران کی پوری توجہ عوامی رقوم کا حصول ہے جس سے وہ اپنے اسکول اور مذہبی مطالعات کے مراکز چلاسکیں۔ قومی اور میونسپل دونوں سطحوں پر سیکولر اسرائیلیوں ہریدی یہودیوں کی شکل میں ایک ایسے فرقے سے مقابلہ کرنا پڑرہا ہے جو فوجی خدمات انجام دینے سے منکر ہے اور اپنا زیادہ تر وقت



جمہوری اقدار کی مخالفت میں گذارتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خصوصاً یروشلم میں ہریدی اور سیکولر یہودیوں میں اختلافات گہرے ہوتے جارہے ہیں۔ عربوں کی طرح ہریدیوں کی آبادی بھی سیکولر یہودیوں کی آبادی کے مقابل بڑھ کر دوگنی ہوگئی ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ ہے کہ وہ یہودیوں کے سماجی اتحاد کے قائل نہیں بلکہ یکساں حقوق کی مستحق ایک قومی اقلیت کی حیثیت سے خود کو تسلیم کروانا چاہتے ہیں۔ اسرائیلی قومیت جب سیفرڈی، ہریدی، روس اور عرب ان تمام شناختوں میں بٹ جائے گا تو پھر رہ کیا جائے گا۔ رہی سہی قومی دھارا کو منظم گروہ یا جماعت کا نام نہیں دیا جاسکتا کیونکہ وہ بھی مختلف الخیال افراد کا مجموعہ ہے اور جتنا طاقتور نظر آتا ہے اتنی ہے نہیں۔

اسرائیلی سیاست

اسرائیلی سیاست کے انتشار اور متناسب نمائندگی کی خرابیوں اور وزارتی عہدوں پر افراد کو بٹھانے اور اس کو ہٹانے کے جوڑتوڑ میں اس کی کارفرمائی کا جائزہ بھی اشکنازی اور سیفرڈی یہودیوں کے درمیان رسہ کشی کی روشنی میں لیا جاسکتا ہے۔

اسرائیلی سیاست سے جڑا ہوا اہم ترین سوال یہ ہے کہ مختلف مذہبی گروہوں میں اپنی پارٹی سے وفاداری کا احساس کتنا قوی ہے اور اس کا امکان کتنا ہے کہ ان کی پارٹیاں آئندہ خیمہ بدل لیں گی۔ اس اعتبار سے قومی کیمپ کی نمائندگی لیکڈ بلاک کرتا ہے تو امن پسند کیمپ کی نمائندہ لیبر پارٹی ہے۔ اگرچہ بیشتر ملازمت پیشہ سیفرڈم یہودی لیکڈ بلاک سے قبیلہ جاتی وفاداری کا دم بھرتے ہیں، سیفرڈی یہودیوں کی مطلق حمایت کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ عموماً ایک تہائی سیفرڈی ووٹ لیبر پارٹی کو جاتے ہیں۔

جس کا تجربہ 1992 کے انتخابات میں ہو چکا ہے تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل میں لیبر پارٹی سیفرڈی یہودیوں کے ووٹ کھینچ لے گی کیونکہ اس طبقے کی اجتماعی یادداشت 1950 کی دہائی میں لیبر پارٹی کے نئے لیڈر سے ملنے والے اہانت آمیز سلوک کو نہیں بھول سکتی۔ بہت سے سیفرڈیوں کے نزدیک وہ تہذیبی افراد سے اب بھی وابستہ ہے اور جمہوری خیالات رکھتی ہے جو اسے پسند نہیں۔ اس طرح کوئی مراقشی یہودی لیبر پارٹی کو ووٹ دینے سے کترائے گا اور ایسی پارٹی کی حمایت کرے گا جو روایتی یہودیت سے باغی ہو۔

قومی کیمپ سے امن کیمپ میں منتقلی اور وفاداریوں کے مرکز میں تبدیلی بہت آسان ہے۔ لیکڈ کے زیر سایہ پلنے والی ایک سیفرڈی جماعت وہ ہے جسے لوگ Shas کے نام سے جانتے ہیں جس کا رجحان نسلی اور مذہبی ہے۔ رسمی طور پر یہ اسرائیلی حکومت کے مذہبیت کے فقدان کی مذمت کرتی ہے لیکن ہریدیوں کے برعکس اسرائیل کی قانونی حیثیت کو مسترد بھی نہیں کرتی۔ اس کے لیڈروں اور حامیوں میں سے زیادہ تر فوجی خدمت انجام دے کر Sha کو ان دیگر شدت پسند گروہوں سے ممتاز کر چکے ہیں جن کا فوجی خدمت سے استثناء بیشتر اسرائیلیوں کو مشتعل کر دیتا ہے۔

امن کے حامی کیمپ کے لیے بظاہر روسی یہودیوں کے رجحان میں تبدیلی ایک بہتر امید ثابت ہونی چاہیے جنھوں نے 1992 میں لیبر پارٹی کی حمایت کی اور چار سال بعد خود اپنی پارٹی اور لیکڈ بلاک کی طرف ڈھلک گئے۔ چونکہ زیادہ تر روسی یہودی خاص اسرائیل میں آباد ہو چکے ہیں، وہ یہودی کالونیوں نقدیہ کی طرف سے نسبتاً بے نیاز ہیں۔ وہ اسرائیلی یہودیوں کے ضابطوں کے بھی کم سے کم پابند ہیں اور اسی لیے لیبر پارٹی کی مفروضہ مذہب شکنی سے نالاں بھی نہیں ہیں۔ اگر کوئی بات ان کے نزدیک زیادہ قابل اعتراض ہے تو وہ مذہبی ضابطے جس کی رو سے انھیں یہودیت کے اس زمرے میں نہیں شمار کیا جاتا کہ مذہبی شادی انجام دے سکیں یا ان کی تدفین یہودی قبرستانوں میں ہو۔ ایسا ہو چکا ہے کہ ان کے عالموں نے ان روسی سپاہیوں کو اپنے اسرائیلی کامریڈوں کے بغل میں دفن ہونے کی اجازت نہیں دی جن کی مائیں یہودی نہیں تھیں۔

قومی کیمپ میں پائے جانے والے مختلف عناصر اندرونی اختلافات کی بنیاد پر اپنے اصل موقف سے ٹس سے مس نہیں ہو سکتے اس اعتبار سے انھیں ایک دوسرے کے لیے اچھوت افراد کا گٹھ جوڑ کہا جا سکتا ہے۔ لیبر پارٹی کے لیڈر مسٹر براک کے لیے مذہبی یہودیوں کی ایک بڑی تعداد پر خواہ وہ روسی ہوں یا سیفرڈم فتح پانا اتنا ہی مشکل ہے جتنا امریکہ میں ریپبلکن لیڈر گنگرچ کے لیے سیاہ فام اور ہسپانوی افراد کے ووٹ کا حصول۔ مسٹر تتن یاہو اگرچہ اشکنازی اشرافیہ کے فرد ہیں خود کو اچھوت ظاہر کرنے کی کامیاب کوشش کرتے رہے ہیں اور ان کی مخلوط حکومت ان تمام اسرائیلیوں کو ایک موقف پر جمع کرتا ہے جن کے ساتھ پرانے نظام نے انصاف نہیں برتا تھا۔

اسرائیلی رویے پر اوسلو معاہدہ کا اثر کم گہرا نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مسٹر تتن یاہو نے اس جانب پیش رفت کو سست کرنے کے لیے اپنے بس بھر کوشش کی ہو لیکن لیکڈ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ عظیم تر اسرائیل کی ایک ایک انچ زمین سے چمٹے رہنے کی پالیسی ترک کر دے۔ بیرون کی 80 فیصد آراضی سے دست بردار ہونے کا گذشتہ سال مسٹر تتن یاہو کا معاہدہ امن کے بدلے زمین دینے کے عام اصول کی قبولیت کا اشارہ ہے۔



یہ سوچنا تو نادانی ہوگی کہ امن ناگزیر ہے۔ غیر متوقع حالات بڑھتی ہوئی دہشت گردی یا جنگ معاہدہ اوسلو کو پیچھے کر دیں گے تاہم طرفین میں امن کے لیے کوشاں افراد کا خیال ہے کہ یہ موقع ہمیشہ حاصل رہے گا تاہم مسٹر تتن یاہو اور مسٹر عرفات کے لیے اس کھڑکی کو کھلا رکھنے میں ہی فائدہ ہے۔ ایک کو دوبارہ انتخاب میں کامیاب ہونا ہے تو دوسرے کو ریاست قائم کرنی ہے اور اگر یہ کھڑکی بند بھی ہو جائے تو سدا بند رہنے والی نہیں ہے۔ ایک طرف یہ حقیقت ہے کہ پیش سال تک اسرائیل آہنی دیوار سے سر ٹکرا کر اسرائیلی ریاست کو فنا کرنے کا عربوں کا خواب منتشر ہو چکا ہے وہیں یہ بھی ایک سچائی ہے کہ تیس سال تک فلسطینیوں کے جذبات کچلنے کی اسرائیلی کوشش کی ناکامی نے مقبوضہ علاقے میں ہمیشہ رہنے کے اسرائیلی خواب کو بھی فنا کر دیا ہے۔

نصف صدی بعد بھی بعض اسرائیلی سرحدیں متنازع ہیں۔ عرب ممالک نے 1947 میں اقوام متحدہ کے پیش کردہ پارٹیشن پلان کو مسترد کر دیا تھا اور نئی اسرائیلی ریاست کے خلاف جنگ چھیڑ دی تھی۔ Transforelam پر قبضہ کر کے مغربی کنارے کا اسرائیل میں انضمام کر دیا گیا تھا جسے اقوام متحدہ نے یہودی ریاست کے ساتھ ساتھ ایک آزاد عرب ریاست کا حصہ تصور کیا تھا۔ لیکن 1948 کی جنگ بندی میں اسرائیل تقسیم کے منصوبے سے زیادہ آراضی پر قابض ہو گیا۔ 1948 سے 1967 تک عرب ممالک اسرائیل اور اس کی سرحدوں کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے رہے۔ اسرائیل نے 1956 کی سویز جنگ میں مرتفع سنائی پر قبضہ کر لیا لیکن بغیر امن

نا مکمل امن ، فلسطینی شہیدی دستوں اور اندرونی اختلافات نے چہروں سے شادمانی اور بشاشت چھین لی ہے ۔ اس پژمردگی کے دو اسباب اور بھی ہیں ۔ ایک تعلق ادھورے صہیونی کاروبار سے ہے تو دوسرے کی جڑیں صہیونیت کی کامیابی میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔

معاہدے کے اسے وہاں سے ہٹنے پر مجبور کیا گیا۔ 1967 کی چھ روزہ جنگ نے مرتفع سنائی کو دوبارہ اسرائیلی قبضہ میں دے دیا اور ساتھ ہی گولان پر بھی اسرائیلی قبضہ ہوگیا۔ اسرائیل کے اس وعدے کے بعد کہ اسرائیل امن کے بدلے سنائی کا علاقہ مصر کو واپس کردے گا۔ 1973 کی جنگ ہوئی تھی۔ 1993 کا معاہدہ اوسلو ایسے وقت میں منظر عام پر آیا جب پرامن مذاکرات کے لیے فضا سازگار تھا اور ان کے تحت مغربی کنارے کو مشترک اسرائیلی اور فلسطینی کنٹرول میں رکھا گیا۔ اردن نے اسرائیل سے 1994 میں امن معاہدہ کرلیا۔ ابھی شام اور لبنان سے امن معاہدہ ہونا باقی ہے۔

ہر پانچواں اسرائیلی عرب ہے

اسرائیل کے عربوں نے خود کو یہودی ریاست کا حصہ بنانا کبھی گوارا نہیں کیا بلکہ اپنے مخصوص قریوں اور قصبوں میں رہنا پسند کیا جس کی مثال عقرہ اور نزارتھ سے دی جاسکتی ہے اور جہاں اب عربوں اور یہودیوں کی مخلوط آبادی پائی جاتی ہے۔ ان میں روسی یہودیوں کی بڑی تعداد ہے۔ عقرہ کا بھی خاص نسلی جغرافیہ ہے۔ وہ اس طرح کہ فصیل بند قصبے میں عرب آباد ہیں اس کے فوراً بعد ایسا علاقہ پڑتا ہے جس میں عرب بھی ہیں اور یہودی بھی۔ 1946 میں فلسطین میں عام تباہی اور یہودیوں سے خانہ جنگی کے نتیجے میں خصوصاً حیفہ میں خونریزی کی افواہ سے شمال میں آباد بہت سے عرب خاندان کینان چلے گئے اور جنوب والوں نے غزہ پٹی میں پناہ لے لی اور یہ اجتماعی انخلاء یہودیوں کے حق میں بڑی نعمت ثابت ہوا۔ اس سے فلسطین میں یہودیوں کی اکثریت ہوگئی اگرچہ لبنان سے فلسطینیوں کو فیملی ری یونین اسکیم کے تحت واپس لانے کے اقدام ہوئے لیکن اس اسکیم کی سخت شرائط نے آگے بڑھنے نہ دیا۔ آج سے پچاس سال پہلے اقوام متحدہ کا منصوبہ تقسیم فلسطینیوں کو اس بناء پر قبول نہیں تھا کہ ان کی اکثریت تھی اور انہیں کو کم علاقہ دیا جارہا تھا۔ اپنے جلاوطن بھائیوں مغربی کنارے اور غزہ پٹی میں آباد فلسطینیوں سے ماضی کی یادوں میں اشتراک کے باوجود اسرائیلی عرب ایک الگ گروہ کی شکل اختیار کرتے گئے۔ اسرائیل کے پہلے 19 برسوں میں وسیع تر فلسطین خاندان سے ان کا سابقہ نہیں پڑا۔ 1967 میں جب تک وہ ایک دوسرے کے رابطے میں آئے ان دو فلسطینی برادریوں کے درمیان خلیج زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اسرائیلی عرب زیادہ خوش حال تھے۔ انہوں نے عبرانی زبان اچھی طرح سیکھ لی تھی اور اس یقین تک پہنچ گئے تھے کہ ان کے مستقبل کا انحصار یہودی ریاست کا حصہ بن کر رہنے پر ہے۔ اس طرح قدیم سرحد کے پار آباد اپنے برادران سے رابطے کے باوجود ایسا لگتا ہے کہ اسرائیل کاری کا یہ عمل برابر جاری ہے اور اپنے فلسطینی بھائیوں کے اس خواب میں شریک رہنے پر بھی کہ مغربی کنارے اور غزہ پٹی میں آزاد فلسطینی ریاست قائم ہوگی، اسرائیلی عرب اسرائیل میں ہی رہیں گے۔ عربوں کے حق رائے دہندگی سے ان کے مکمل مساوی حقوق کا قیاس نہیں کرنا چاہئے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مذہب، نسل اور جنس کے امتیاز کے بغیر مساوات کے تمام دعووں کے باوجود عربوں کو سماجی اور اقتصادی برابری حاصل نہیں ہے اور ان کی نصف آبادی خط افلاس سے نیچے ہے اور تعلیم، صحت، رہائشی سہولت ہر چیز میں یہودیوں سے پیچھے ہیں۔ بعض اسرائیلیوں کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ عرب سماجی امتیاز یا ریاست کی طرف سے دانستہ بے نیازی کا شکار نہیں ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اسرائیلی ریاست کے ابتدائی دور میں بیشتر زمین جس پر عربوں کا کاروبار پھیلا ہوا تھا حفاظتی انتظامات کے نام پر یہودی کالونیوں کے لیے ہتھیالی گئیں اور زیادہ تر علاقے اس فوجی حکومت کے سپرد کردئے گئے جو 1960 کی دہائی میں بھی باقی تھی اور آج بھی عربوں سے امتیاز برتنے کے لیے حفاظتی انتظامات کی ہی آڑ لی جاتی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ چونکہ عرب فوجی خدمات نہیں انجام دیتے اس لیے وہ بہت سی فلاحی سہولتوں سے محروم کردئے جاتے ہیں۔ یہ حفاظتی انتظامات کے ہی نام پر کیا گیا تھا کہ اسرائیل الیکٹرسٹی کارپوریشن کے تیرہ ہزار ملازمین سے صرف پانچ عرب تھے۔

تاہم نمائندگی اور بدلتے ہوئے جماعتی اتحاد پر مبنی اسرائیلی سیاسی نظام میں عربوں کی انتخابی اختیار سے محرومی کا اصل سبب ان کے داخلی اختلافات اور مسلم، عیسائی، دروزی فرقوں کے درمیان تعلقات ہیں۔ کمیونسٹوں اور اسلامی بنیاد پرستوں کے درمیان اختلافات پہلے سے ہی واضح ہیں اور جب انہوں نے اپنے اختلافات کو دور کرنا بھی چاہا تو حکومت کی پالیسی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ مثلاً جب دو عرب پارٹیاں 1996 ، میں میدان میں اتاری گئیں تو یہودی جماعتوں نے اتحاد کے لیے انہیں قابل اعتماد نہ سمجھا۔ کسی اور ڈیموکریسی میں عرب پارٹی سے اتحاد کو اس طرح معیوب قرار دینا تقریباً سازش ہی سمجھا جائے گا لیکن اسرائیل میں امن و امان کی صورت حال کی دہائی دے کر اسے جائز گردانا جارہا ہے۔ عرب پارٹیوں سے یہودی ریاست کی حیثیت سے اسرائیل کی قانونی حیثیت کا اعتراف درکار ہے لیکن اس اعتراف کو کیبنیٹ میں کوئی وقعت حاصل نہیں ہے۔ اسرائیل کے برابر کے شہری کی حیثیت سے ان پر اعتبار ہی نہیں کیا جاتا۔

واقعہ یہ ہے کہ عرب آبادی سے امن و امان کو لاحق خطرے کا خوف عربوں کی

سماجی اور اقتصادی مواقع سے محرومی کا جواز نہیں بن سکتا۔ فوجی معیشت میں اقلیت کی مناسب مشارکت سے ہی اسرائیل زیادہ محفوظ رہ سکتا ہے۔ عربوں کو اسرائیلی زندگی میں شرکت پر جو باتیں آمادہ کر سکتی ہیں ان میں دونوں کے درمیان امن کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ عربوں پر اسرائیلیوں کا اعتماد بھی بڑھے گا اور وہ عربوں کو برابر کے شریک کار کی حیثیت سے تسلیم کریں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا کب ہوگا؟

یہودی اور غیر یہودی

اسرائیل کے عربوں کی تقدیر آزاد فلسطین سے ہی وابستہ نہیں بلکہ خود اسرائیلی دائرہ کار میں بہت سی تبدیلیوں سے بھی وابستہ ہے مثلاً اسرائیلی عربوں کے ایک تعلیم یافتہ حلقے کا خیال ہے کہ اس سے پہلے کہ عرب آبادی اسرائیل کا برابر کا حصہ بنے اسرائیل کو اپنا قومی نغمہ اور خود اپنا نام بدلنا چاہئے۔ قومی شعائر میں محض ایک مذہب کو جگہ دے کر اسرائیل جمہوریت ہونے کا دعوی نہیں کر سکتا اور اس لیے واپسی کے قانون کو منسوخ ہونے چاہئے کیونکہ یہ جمہوری اقدار کے منافی ہے کہ کسی بھی یہودی کو اسرائیل کی شہریت دے دی جائے اور دوسری طرف فلسطینی پناہ گزینوں کو اس حق سے محروم رکھا جائے۔ یہ خیال اکا دکا یہودیوں کو پسند ہے کیونکہ اسرائیل امریکہ کی طرح مہاجرین کی سرزمین ہے۔ جو جمہوری دائرہ کار میں کئی اقلیتوں کو یکجا کرنے کے لیے کوشاں ہے جہاں سب کے ساتھ مساوات، مذہب اور مملکت کے لیے ایک دوسرے سے علیحدگی لوگوں کے لیے ضرور کشش رکھتی ہوگی اور اس میں مابعد صیہونیت کا رجحان بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بعض افراد کے نزدیک مابعد صیہونیت سے مراد اسرائیل کے غیر یہودی شہریوں کی حیثیت کو اوپر اٹھانا اور غیر اسرائیلی یہودیوں کی حیثیت کو کم کرنا ہے جبکہ دوسرا حلقہ اس موقف پر قائم ہے کہ صیہونیوں کا مستقبل یوروپ میں محفوظ نہیں ہے اس لیے انہیں اپنی ریاست قائم کرنی ہے جس کا وجود اب ثابت ہے۔

اسرائیل چونکہ یہودیوں کو درجہ اول کی قوم تصور کرتا ہے اس لیے وہ ایسی ریاست قائم نہیں کرے گا جس میں تمام اسرائیلی شہریوں کو یکساں مواقع حاصل ہوا اس میں غریب سیفرڈمیوں کی حالت بہتر ہو سکتی ہے۔ روسی یہودیوں کی یہ ریاست نئے گھر میں آنے کا پروانہ دے سکتی ہے اور قدامت پسند یہودیوں کے قومی دولت میں حصہ داری کے دعوے کو تسلیم کر سکتی ہے اور کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ یہ جانتے ہوئے کہ اسرائیل کی 80 فیصد آبادی یہودیوں پر مشتمل ہے۔ یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ اکثریت اپنی دستوری مراعات سے دست بردار ہو جائے گی اور اسرائیل اپنی یہودی شناخت پر اصرار سے باز آجائے گا۔ تاہم عالم یہودیت سے

ایک طرف یہ حقیقت ہے کہ تیس سال تک اسرائیلی آہنی دیوار سے سر ٹکرا کر اسرائیلی ریاست کو فنا کرنے کا عربوں کا خواب منتشر ہوچکا ہے وہیں یہ بھی ایک سچائی ہے کہ تیس سال تک فلسطینیوں کے جذبات کچلنے کی اسرائیلی کوشش کی ناکامی نے مقبوضہ علاقے میں ہمیشہ رہنے کے اسرائیلی خواب کو بھی فنا کر دیا ہے۔

اسرائیل کے رشتے میں تبدیلی آرہی ہے۔ عالمی یہودی شناخت کے احساس کی پرورش میں تین عوامل کار فرما ہیں۔ اول یہ کہ ہالوکاسٹ کی یادگذشتہ نصف صدی کے دوران دھندلی ہوتی ہے۔ سوویت یہودی آبادی کو آزاد کرانے کی مہم کا خاتمہ ہو چکا ہے اور تیسرے یہ کہ یہودی ریاست کی کامیابیوں اور اسے درپیش مصائب کے حوالے سے پوری دنیا میں یہودیوں کی شناخت کا رجحان بدل رہا ہے۔

اس کے علاوہ یہ اسرائیل کے یہودی اور یوروپ میں منتشر یہودی نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کے بارے میں نئے انداز سے سوچ رہے ہیں بلکہ انہوں نے غیر یہودی دنیا سے اپنے روابط کے بارے میں بھی سوچنا شروع کر دیا ہے۔ اور دلچسپ بات یہ کہ یوروپ کے یہودی غیر یہودی دنیا سے اپنے تعلقات بہتر کرنا چاہتے ہیں اور ہر چند کہ یہ اسرائیل میں دونوں فریق کسی سمجھوتے کی تلاش میں اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کسی سمجھوتے کے امکان میں یقین بڑھتا جارہا ہے جس کا احساس 1992 میں اسحاق رابن کے وزارت سنبھالنے پر ہو چکا تھا جنہوں نے نسل در نسل چلتے آئے خوف کو ذہنوں سے نکالنے کی کوشش اور جدید دنیا کو گلے لگانے کے عزم کا اظہار کیا تھا۔ اس کے بعد معاہدہ اوسلو کے ذریعے یہودی ریاست کو دائمی ہلاکت میں ڈالنے کے مفروضہ پر رابن کے قتل پر سیاسی مکتب فکر کے اسرائیلیوں کو صدمہ پہنچایا، باوجود اس کے کہ اس حیرت زدگی کے عالم میں بھی بہت سے اسرائیلیوں نے لیکڈ بلاک کی اقتدار پر دوبارہ واپسی کا خیر مقدم کیا تھا لیکن اس پسندیدگی کے اسباب دوسرے تھے جن کا معاہدہ اوسلو اور امن کوششوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ رابن اور پیریز کی طرف سے سیکولرزم، بین الاقوامیت اور آفاقی اقدار پر اصرار کو چاہے لیبر پارٹی سے وابستہ کر لیا جائے لیکن یہ تمام عوامل اسرائیل میں مغربی اثرات کے تیزی سے بڑھتے ہوئے رجحان کا اشارہ ہیں۔ قدیم صیہونیت کی طرف سے ایک مشترک خطرے کا نعرہ بے جان پڑ چکا ہے اور اسرائیل کے امن پسند اور قومی خیموں کے درمیان اختلافات واضح طور پر سامنے آچکے ہیں۔ □

سوال جب کسی کا انتقال ہوجائے تو کیا اس کے اعزاء کے لیے غم کے اظہار کے طور پر سیاہ لباس پہننا ضروری ہے۔ خصوصاً جب کسی عورت کا شوہر فوت ہوجائے تو اسے کس طرح کا لباس پہننا چاہیے؟

ریحانہ، جبل پور

جواب غم کا لباس سے کیا تعلق ہے؟ کسی کی موت پر رنج و غم کا اندازہ تو اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کا مرنے والے سے کیا رشتہ تھا؟ اب آپ کسی بھی طرح کا لباس پہنے ہوئے ہوں اور کسی بھی رنگ کا اس سے کوئی فرق واقع ہونے والا نہیں ہے۔ غم کے اظہار کے بھی الگ الگ طریقے ہوتے ہیں۔ بعض خاموشی اور سنجیدگی سے اس کا مظاہرہ کرتے ہیں اور بعض لوگ دھاڑیں مارتے ہیں جب کہ انہیں معلوم ہے کہ موت برحق ہے۔ یہ بات تو اپنی جگہ درست ہے کہ موت کا غم ایک فطری امر ہے۔ خود رسول اللہ کی آنکھ سے بھی اولاد کی موت پر آنسو ٹپکے تھے لیکن بکا و بین سے آپ نے منع فرمایا ہے۔

اگر کسی معاشرے میں مختلف مواقع کے لیے مختلف طرز اور رنگ کے لباس پہننے کا رواج ہے اور اس تصور کے تحت اس میں موت پر سیاہ لباس پہنا جاتا ہے تو لباس صرف اتنی نشاندہی تو ضرور کرسکتا ہے کہ صاحب لباس کے یہاں کسی کی موت ہوئی ہے لیکن یہ لباس اس شخص کے غم کی گہرائی کی بھی دلالت کرے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

سخت مشکل میں ہوں اس کے ساتھ رہوں یا علیحدگی اختیا کرلوں

کسی عورت کا شوہر فوت ہوجاتا ہے تو دوسری عورتیں سب سے پہلے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ کی چوڑیاں توڑ دیتی ہیں۔ گویا یہ اصل بیوگی کی علامت سمجھی جاتی ہے حالانکہ اس کا دل پہلے ہی ٹوٹ چکا ہوتا ہے، یہ کوئی محسوس نہیں کرتا۔ بعض فرقوں میں تو بیوہ عورت کے بال بھی مونڈ دیئے جاتے ہیں یعنی اس کے تمام آرائشی لوازم سے اسے محروم کردیتے ہیں کہ کسی کی نگاہ اس پر ایک عام انسان کی حیثیت سے نہ اٹھے بلکہ لوگ اس سے ایک نحوست اور بدشگونی منسوب کر بیٹھتے ہیں۔ عام طور پر عورت کی سسرال والوں کا یہی رویہ ہوتا ہے اور اگر یہی حادثہ ان کی بیٹی کے ساتھ پیش آجائے تو وہ اپنی بیٹی کے سسرال والوں سے شاکی ہوتے ہیں۔ بیوہ ہوجانے والی عورت کو توہم پرست لوگ کنگھی چوٹی کی بھی اجازت نہیں دیتے۔

یہ تمام تصورات مختلف سماجی رواجوں اور رسوم کی بنا پر راسخ ہوگئے ہیں۔ اسلام میں ان کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہیں۔ اسی عقیدے کی بناء پر اسلام غم اور خوشی کے غیر فطری مظاہرے اور مبالغے کو مستحسن قرار نہیں دیتا۔

سوال میری ایک نوجوان سے شادی ہوجانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اسے ایک ایسا مرض لاحق ہے جس کا ذکر شادی سے پہلے اس کے گھر والوں نے مجھ سے نہیں کیا تھا جب کہ وہ اس کے بارے میں جانتے تھے۔ اب میں سخت مشکل میں ہوں کہ اس کے ساتھ زندگی گزاروں یا اس سے علیحدگی اختیار کرلوں۔ صادقہ نسیم، مرادآباد

جواب جب آپ کی شادی کی بات چیت چل رہی تھی تو آپ کے گھر والوں نے لڑکے والوں سے یقیناً یہ واضح کرلیا ہوگا کہ لڑکے میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ یعنی ہاتھ پیر سے تندرست ہے، کوئی موذی مرض اسے لاحق نہیں ہے اور جنسی اعتبار سے بھی صحت مند ہے۔ اب آپ کو یہ دیکھنا ہے کہ آپ کے شوہر کو کس طرح کا مرض لاحق ہے۔ آج کل زیادہ تر امراض کا علاج ہوجاتا ہے۔ اگر آپ کو اس کا شبہ ہو کہ وہ جسمانی اعتبار سے حق زوجیت ادا کرنے کی حالت میں نہیں ہے تو اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ طبی جانچ کراکے اس شبہ کا ازالہ یا اس کی تصدیق کری جائے۔ اگر صورت حال منفی ہے تو علیحدگی کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے اور اس مرحلے کو خوش اسلوبی سے طے کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک سوال اس بات کا ہے کہ لڑکے کے گھر والوں نے آپ سے مرض کی بات چھپائی تو انہوں نے غلطی کی۔ اب آپ کو دیکھنا یہ ہے کہ اگر آپ کا شوہر صالح ہے، دیندار ہے، آپ کا خیال رکھتا ہے اور ان سب کے مقابلے میں اس کے مرض کا پہلو ایسا ہے کہ اسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور اس کا علاج ہوسکتا ہے تو اللہ پر بھروسہ کرکے اس کے ساتھ نباہ کیجیے۔ ایک بات اور بھی قابل غور ہے کہ بعض لڑکوں اور لڑکیوں کے بارے میں طرفین کی عورتوں میں کچھ اس طرح کی کھسر پھسر بعض دفعہ ہونے لگتی ہے کہ دولھے یا دلھن کے جسم کے کسی حصہ پر سفید داغ ہے۔ یہ ایک عام عیب ہے جو نہ ہونے پر بھی نکال لیا جاتا ہے۔ اب اس سے طرفین کے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوتے ہیں جب کہ ایسے نہ جانے کتنے لوگ ہیں کہ ان کے جسم پر کہیں کوئی دھبہ تو ہے لیکن ان کے خدشات و شبہات کے برعکس اس دھبے نے کوئی سنگین شکل اختیار نہیں کی اور نہ ہی اس کی وجہ سے انہیں اپنے کاموں میں کوئی دقت پیش آئی۔ ممکن ہے کہ آپ کے ساتھ بھی کوئی ایسی ہی بات ہو جس کا آپ نے ذکر نہیں کیا ہے۔

فرض کرلیجیے کہ آپ کے یہاں بچے ہوجاتے اور اس کے بھی بعد میں آپ کے شوہر کو کوئی مرض لاحق ہوجاتا تو آپ اس سے علیحدگی کے بارے میں سوچتیں یا اس کے علاج کی طرف توجہ کرتیں۔ اس لیے آپ ازدواجی زندگی کی نعمت کا احساس کرتے ہوئے ایسا کوئی اقدام نہ کریں جس سے آگے مزید دشواری پیش آئے اور یقین رکھیں کہ مرض اور شفا دونوں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اپنے شوہر کے سلسلے میں دوا اور دعا دونوں کا سہارا لیں۔

سوال میری عمر تیس سال ہے۔ میرے گھر والوں نے عزیزوں میں سے ایک لڑکے سے میری شادی طے کردی ہے۔ وہ مجھ سے پانچ سال چھوٹا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ایسی شادیاں جس میں لڑکے کی عمر لڑکی سے کم ہو، کامیاب نہیں رہتیں۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

زہرہ بانو، بہرائچ

جواب کم عمر کے شوہر سے شادی کے فوائد کیا ہیں، اس کا انحصار حالات پر ہوتا ہے اور عموماً اس طرح کی شادیوں کے ہونے میں بھی حالات کا ہی دخل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ خود کو ہی لے لیجیے۔ اگر آپ کے والدین خاندان کے باہر رشتہ تلاش کرتے تو آپ کا ہم عمر یا آپ سے بڑا لڑکا مل سکتا تھا۔ لیکن آپ کے والدین کی

نظر خاندان میں موجود کئی لڑکوں کے درمیان اسی لڑکے پر پڑی کیونکہ جیسا کہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اپنی کم عمری کے باوجود اخلاق و عادات، علم و فضل، دینداری اور ذمے داری کے اعتبار سے یہ لڑکا دوسروں سے بہتر نکلا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مرد خود اپنے سے زیادہ عمر کی عورت کا انتخاب کرے۔ فرض کریئے۔ کسی مرد کی عمر 35 سال ہے اس کی کاروباری مصروفیات ہیں اور پہلی بیوی فوت ہو چکی ہے اس سے اس کے بچے ہیں اور ان بچوں کی ذمے داری وہ پوری طرح محسوس کرتا ہے۔ اب اسے ضرورت ہے ایک ایسی شریک حیات کی جو نہ صرف گھر کی نگہبانی کرسکے بلکہ بچوں کی بھی اچھی تربیت کرسکے۔ ایسی حالت میں اسے ضرورت ہے ایک باشعور، سنجیدہ اور ذمے دار عورت کی جو اس کی ان توقعات پر پوری اترے۔ چونکہ یہاں عورت کی کم عمری اور اس کے شباب کو اولیت نہیں حاصل ہوگی بلکہ اس کے شعور اور بالغ نظری پر توجہ زیادہ ہوگی۔ اس بارے میں ہمارے ایک دوست جمیل صاحب بیان کرتے ہیں کہ وہ دس بارہ سال لندن میں گزار کر وطن واپس لوٹے۔ اگرچہ ان کی عمر ابھی 34 سال تھی لیکن اس عرصے میں انہوں نے کافی مال و دولت جمع کر لیا تھا۔ مکان، جائیداد بھی یہاں وطن میں خاصی تھی۔ ماں باپ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، بھائی کوئی تھا نہیں، دو بہنیں اپنے گھر بار کی ہو چکی تھیں۔ اس خیال سے کہ جو کچھ املاک اور نقدی پاس ہے اس کی بہتر حفاظت کے نقطہ نظر سے خاندان کی ہی کوئی لڑکی تلاش کی جائے۔ اپنی خالہ کی مدد سے ایک لڑکی تک رسائی ہوئی جو ان سے چھ سات سالہ بڑی تھی لیکن خالہ کو اس کی سلیقہ شعاری اور سنجیدگی بہت پسند آئی تھی۔ خیر یہ شادی ہو گئی اور دلہن ویسی ہی نکلی جیسا کہ خالہ نے ذکر کیا تھا۔ اس نے گھر کے تمام انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جمیل صاحب بے فکری سے اپنے کاروبار میں لگے رہے۔ ماشاء اللہ ان کے یہاں دو بچے بھی ہیں اور وہ تعلیمی مراحل طے کر رہے ہیں۔

سوال

میں حسین تو نہیں لیکن عام شکل و صورت کی عورت ہوں۔ متوسط خاندان سے تعلق رکھتی ہوں اور تعلیم بھی درمیانی ہے یعنی یہ کہ یونیورسٹی کی منزل تک نہیں پہنچ پائی ہوں۔ ووکیشنل کامرس میں سینیر سکنڈری تک تعلیم حاصل کی ہے۔ اسکول کے زمانے میں میری سب سے بڑی آرزو یہ ہوتی تھی کہ میں ایسے کپڑے پہنوں جس کی سب تعریف کریں اور کہیں بھی میری سبکی نہ ہو۔ میرے گھر کے حالات اچھے نہ تھے ایسے میں شادی بیاہ کا میں تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ نہ میرے پاس حسن ہے اور نہ ہی دولت۔ شادی کے خواہش مند لوگ یہی دو باتیں دیکھتے ہیں۔ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی اتفاقاً مجھے خلاف توقع سکریٹری کی ملازمت مل گئی۔ کچھ دنوں کے بعد میرے ڈائریکٹر مجھ پر مہربان ہو گئے۔ وہ شادی شدہ اور دو بچیوں کے باپ تھے اور عمر 50 سال تھی۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور انہوں نے ایک دن میرے سامنے شادی کی تجویز رکھی مجھے ہر وہ چیز جس کے بارے میں میں نے سوچا بھی نہ تھا، آسانی سے ملتی جا رہی تھی اس لیے مجھے کیا عذر ہو سکتا تھا۔ میں نے شادی کی رضامندی دے دی۔ شادی ہو گئی اور ڈائرکٹر صاحب نے ایک صاف ستھرے علاقے میں ایک فلیٹ لے کر مجھے دے دیا اور ہفتے میں ایک دن اپنے وہاں رہنے کا مقرر کیا۔ اس طرح تین سال ہو گئے اور میں ایک لڑکی کی ماں بن گئی۔ اب یہ ہوا کہ میں مقررہ دن پر ان کا انتظار کرتی اور وہ نہ آتے۔ جب چند ہفتے خالی گئے تو میں ان کے دفتر پہنچی اور ان کی اس بے توجہی کی وجہ پوچھی تو جواباً انہوں نے اتنا کہا کہ "میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں نیک شوہر عطا فرمائے" یہ الفاظ مجھ پر بجلی بن کر گرے۔ اب مجھ پر ان کی نیت ظاہر ہو گئی۔ میرے اور ان کے درمیان زوجیت کے رشتے کو ثابت کرنے کے لیے واحد ثبوت وہ بچی تھی۔ اس کی بناء پر میں نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جہاں مجھ سے نکاح نامہ طلب کیا گیا وہ میرے پاس تھا نہیں کیونکہ ڈائرکٹر نے پہلے ہی اسے میرے فلیٹ سے کسی وقت غائب کر دیا تھا۔ اس کاغذ کے ٹکڑے کے نہ ہونے سے میں انصاف سے محروم رکھی گئی حالانکہ میری بچی عدالت میں اپنے باپ کو دیکھتے ہی ابو ابو کہتے ہوئے لپکی تھی لیکن انصاف کی نظر میں شاید جذبات کی کوئی گنجائش نہیں۔

زیبا نعیم، پونہ

جواب

بچپن کی عسرت اور تنگ دستی نے آپ کو حد درجہ ناامیدی کی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا اسی لیے شعور کو پہنچنے کے بعد بھی آپ یہ اندازہ نہ کر سکیں کہ ایسی کتنی ہی لڑکیاں ہیں کہ حسین و جمیل ہونے کے باوجود ان کی شادی نہیں ہو پاتی یا بہت تاخیر سے ہوتی ہے کیونکہ ان میں دیگر اوصاف مفقود ہوتے ہیں اسی طرح صرف مال کے زور پر بھی اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو جائے یہ کوئی ضروری نہیں۔ آپ یہ تو کہہ سکتی ہیں کہ یہ دو معیار نمایاں طور پر مدنظر رکھے جاتے ہیں لیکن ایسا نہیں کہ دیگر پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جائے کیونکہ حسن اور دولت کا تعلق صرف ظاہر سے نہیں بلکہ باطن سے بھی ہے۔ حسن کے ساتھ خوش خلقی، ملنساری اور ہمدردی کے اوصاف ضروری ہیں اس طرح دولت مندی کے ساتھ فراخدلی اور تواضع کی خصوصیات ہوں تو ازدواجی زندگی کی کامیابی کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔

اب آیئے اصل مسئلے کی طرف۔ چونکہ محرومی کے احساس نے آپ میں ایک رازداری کے رجحان کو جنم دے دیا تھا اس لیے ملازمت ملنے کے بعد جب ڈائریکٹر نے آپ کی طرف التفات برتنا شروع کیا تو اس کا مطلب آپ سمجھنے لگی تھیں لیکن ان کے بارے میں آپ نے کسی تحقیق کی ضرورت نہ سمجھی اور پھر جب نوبت شادی کی آگئی تو اس میں اپنے عزیز و اقارب سے مشورہ کرنا ضروری تھا۔ لیکن آپ کے بیان سے انداز ہوتا ہے کہ آپ نے بڑی جلد بازی سے کام لیا۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ ایک شخص سے آپ کا رابطہ ملازمت کے حوالے سے قائم ہوا ہے، لوگ اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ اس کے عادات و اطوار کیسے ہیں اور جب وہ شادی شدہ تھا تو اس کی پہلی بیوی تھی یا نہیں؟ اگر تھی تو اس کے خیالات اپنے شوہر کے بارے میں کیسے تھے؟ ان تمام باتوں کی چھان بین ضروری تھی۔

اب آپ کے سامنے مسئلہ ہے بچی کی زندگی کا اور ذریعہ معاش کا کیونکہ شادی ہونے کے بعد ملازمت آپ چھوڑ چکی ہوں گی۔ عدالتی کاروائی کے حوالے سے ایک بات سمجھ میں یہ نہیں آئی کہ نکاح نامے کی عدم موجودگی

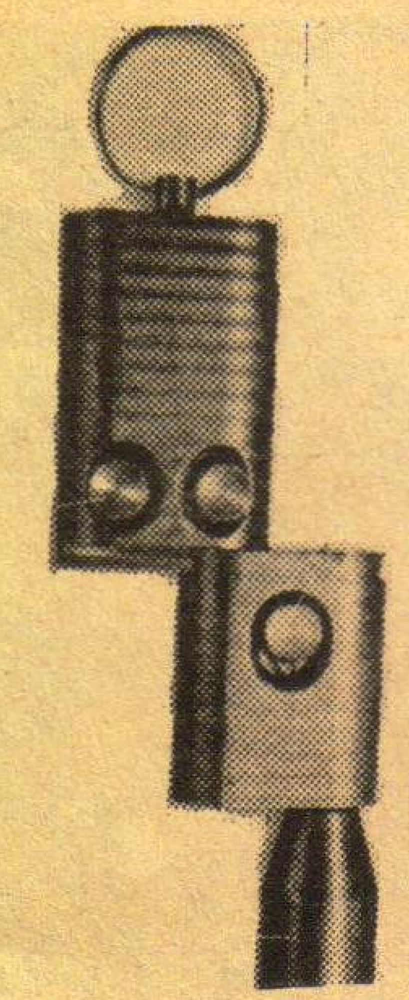
باقی صفحہ ۱۷ پر

ہوشیار! یہ چابی نہیں بندوق ہے

مختصر خفیہ ہتھیار کا ذکر جو باسانی سیکورٹی کو دھوکہ دے سکتے ہیں

کچھ نوجوان ابھی سنیما ہال سے نکلے ہیں۔ ان کی جیبوں میں چابی کی زنجیر نما پستول لٹکے ہوئے ہیں جن کی مار بیس فٹ کی دوری سے مہلک ہوسکتی ہے اور ہاں او ایس اے برانڈ کے یہ پستول نقلی نہیں بلکہ اصلی ہیں۔ یہ سستے بھی ہیں اور آسانی سے دستیاب بھی۔ گذشتہ برسوں میں یہ مختصر بندوقیں جو بلغاریہ میں بنی ہوئی ہیں، آسٹریلیا، یونان اور انگلینڈ کے ہوائی اڈوں پر ذمہ داران کی نگاہوں سے بچ کر نکلتی رہی ہیں۔ سٹیل ڈٹکسٹر اور ایکس رے کی زد میں بھی نہ آسکیں۔ یہ سب ہوچکنے کے بعد ایک بار لندن میں کسی افسر نے ایک مسافر کی چابی کی زنجیر دیکھنے کی کوشش کی تو مسافر مائیکروگن چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ جنوبی یوروپ میں ہر وقت دستیاب اور امریکہ میں ممنوع اس مختصر بندوق کی قیمت صرف بیس ڈالر ہے۔ اب ذمہ داران حیرت زدہ ہیں کہ نہ جانے ایسی کتنی بندوقیں ان کی آنکھ میں دھول جھونک کر لوگ نکال لے گئے ہوں گے یا عنقریب نکال لیے جانے کا امکان ہے۔

ابھی گذشتہ ماہ مصروف ترین بین الاقوامی پولس ایجنسی انٹرپول نے عالم گیر پیمانے پر امن و قانون کے محافظوں کو ان بندوقوں سے خبردار کیا ہے۔ وفاقی فضائی انتظامیہ (ایف اے اے) نے امریکی ہوائی اڈوں پر حفاظتی عملے کو چوکنا کردیا ہے۔



پولس کو جس بات نے پریشان کررکھا ہے وہ ان بندوقوں کی مار کرنے کی قوت نہیں کیونکہ یہ بندوق ہلکی طاقت کے دو کارتوس داغ سکتی ہے بلکہ یہ کہ تمام حفاظتی انتظامات سے بچ کر اس کا نکل جانا ہے۔ انکے کسی کی گرفت میں نہ آنے کا امکان یوں بھی رہتا ہے کہ عموماً مسافر دھات کی بنی ہوئی اشیاء پلاسٹک میں لپیٹ لیتے ہیں جو ایکس رے مشین کی زد پر نہیں آپاتیں۔ ایرپورٹ عملے اور پولس کو یہ توقع نہیں ہے کہ اس طرح کی بندوقوں کو جہازوں کے اغوا میں استعمال کیا جائے گا کیونکہ اغوا کار اکثر ڈرا دھمکا کر اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں جو اس مختصر اسلحے کے ذریعے ممکن نہیں۔ تاہم پولس کو ان ہتھیاروں کی طرف سے تشویش ہے جو چالاکی کے ساتھ مختلف طرح کے بھیس میں لے جائے جاسکتے ہیں اور اس رجحان میں تیزی سے اضافہ بھی ہورہا ہے۔ "ناولٹی" ہتھیاروں میں سے جو ہارڈویر اسٹوروں پر دستیاب پرزوں سے بنائے جاسکتے ہیں ایک ہتھیار "قلم بندوق" ہے جو بہت قریب سے انسان کو ہلاک کرسکتی ہے۔ بعض مختصر بندوقیں بیلٹ کے بکلس میں باندھی جاسکتی ہیں اور ایسی ہی بندوقیں سگریٹ کے پیکٹ کی شکل میں ملتی ہیں اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ ذمہ داران ان سے بے خبر نہیں ہیں۔ ▭

انسانی رشتوں کی حرمت اور اسلام

تحریر: سس احمد

انسانیت کی بقا اور انسانی معاشرے کے امن و تحفظ کا انحصار اس معاشرے کے افراد کے ذہنی رویوں اور ان کے افعال میں اعتدال و توازن پر منحصر ہے۔ اس اعتدال و توازن کا سرچشمہ مذہبی تعلیمات بھی ہیں اور سماجی مفکروں اور عالموں کے وضع کردہ اصول بھی۔ یہی اصول صدیوں سے انسانی اعمال کی صحت اور قبولیت کا معیار بنے ہوئے ہیں اور ان سے تجاوز یا انحراف کرنے والا فرد سماج یا قانون کی نظر میں قابل مواخذہ قرار پاتا رہا ہے۔ یہ اصول و ضوابط زندگی کے ہر شعبے کا احاطہ کرتے ہیں اور ان میں برتی جانے والی اقدار کا احترام ہر مذہب میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔ اگر ان میں کوئی فرق ہے تو مدارج کا۔ بنیادی تصور میں کوئی اختلاف

نہیں ہے۔

ان اقدار میں سر فہرست انسانی رشتوں کا احترام ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ اگر اس زمین پر ایسے افراد کا ایک معاشرہ قائم ہو جائے جو رشتوں کی حرمت سے بے نیاز ہو تو انسان کیا بہیمیت اور وحشی کی زندگی کے دور میں واپس نہیں چلا جائے گا۔ آثار کچھ اس طرح کے ہیں کہ روئے زمین پر ایک ایسے ہی اقدار شکن معاشرے کے قیام کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس کے لیے افراد کی ذہن سازی کا کام کرنے میں مغرب پیش پیش ہے جو جدید دنیا میں عقل اور سائنس کی ترقی کا نقیب بنا ہوا ہے۔ آج طاقت بھی اس کے ہاتھ میں ہے اور دولت بھی اور ان دونوں کے بوتے پر سیاست پر بھی اسی کا قبضہ ہے۔ وہ خود کو ممتاز رکھنے کی خواہش میں انسانی زندگی کے تمام عملی نمونوں کو مسترد کرتے ہوئے افراد کے ذہنی اور فکری ارتقاء کے ایسے اصول دنیا پر مسلط کرنا چاہتا ہے جو کسی بھی نظام اقدار میں مستحسن نہ قرار پاسکے۔ اس کے بنائے ہوئے عملی نمونے خود اس مذہب کی اخلاقی تعلیمات سے میل نہیں کھاتیں جس کے حوالے سے مغرب کی شناخت دیگر مذاہب کے مقابل کی جاتی ہے۔



مغرب کی اسی ریشہ دوانی کے تحت تربیت اطفال کے ضمن میں ایک اصول یہ پیش کیا گیا کہ بچوں کی عمر کے آموزشی دور میں انہیں اپنی سرگرمیوں کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ اپنے اردگرد کی اشیاء کے مشاہدے سے تحریک پاکر ان کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں۔ اس اصول کو وسعت دے کر اس کا اطلاق گھر کے ماحول پر بھی کیا گیا اور وہ اس طرح کہ بچوں کے لیے ان کے الگ الگ کمرے مخصوص کر دئے جائیں تاکہ ذمہ دار اشخاص کی حیثیت سے زندگی گزارنے کی صلاحیت اور خود اعتمادی ان میں پیدا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک زریں اصول تھا لیکن اس اصول کو حقیقی زندگی میں برتنے کے لیے ایک شرط یہ رکھی گئی تھی کہ بچوں کو اپنے خیالات کے مطابق آزادانہ عمل کے لیے چھوڑ تو ضرور دیا جائے لیکن ان کی نگرانی بھی ان کے علم میں لائے بغیر اتنی وسیع

اسلام نے رشتوں کی حرمت پر مختلف پیرایوں میں اسی بنا پر تاکید کی ہے کہ یہ سماجی اور عائلی نظام کو صحیح نہج پر قائم رکھنے کا ضامن ہے۔

پیمانے پر ہو کہ جس لمحے بھی متعینہ انسانی معیاروں سے لغزش کرے تو اسے فوراً سنبھال لیا جائے۔ بد قسمتی سے آزادی اطفال کے حامیوں نے نگرانی کے عنصر کو اس حد تک پس پشت ڈال دیا کہ عمل کی یہ آزادی بد عملی کی آزادی میں تبدیل ہو گئی

اس کی روشن مثال حال ہی میں ٹائمز آف انڈیا کے مراسلاتی کالم میں شائع ایک رپورٹ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح بلوغت کے مرحلے میں قدم رکھنے والی ایک لڑکی نے اپنے تجسس کو مطمئن کرنے کے لیے سوتے ہوئے بھائی کی طرف پیش دستی کی اور دونوں میں وہ سب کچھ ہوا جس کے بیان کا یہ قلم متحمل نہیں ہو سکتا۔

اس نوع کے بے غیرتی کے واقعات آج امریکی معاشرے میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں اور وہاں اصلاح اطفال کے مقصد سے کھولی گئی جیلوں میں ایسے لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد ایک سے زیادہ ہوتی ہے جو رشتوں کی حرمت کو پامال کر چکے ہوں۔ اس جرم کی سنگینی، انسانی اور اخلاقی حمیت کا احساس کر کے انہیں چھوڑ دیا جاتا ہے گویا کہ جو کام پہلے کرنے کا ہوتا ہے وہ پانی سر سے گزر جانے کے بعد کیا جاتا ہے۔ دراصل یہی وہ بات ہے جس کی طرف سے چشم پوشی برتنے کی بناء پر یہ ساری خرابیاں وجود میں آتی ہیں۔ بچوں کی اس ناقص اور ادھوری تربیت کا حامی حلقہ یہ تو سمجھتا ہے کہ چھوٹی عمر کے بچوں کو کڑوی دوا نہیں دی جا سکتی یا دواؤں کو بچوں کی پہنچ سے دور رکھنا چاہئے لیکن وہی طبقہ جنسی تجربے جیسی چیز سے بچوں کی روشناسی کو مباح قرار دیتا ہے، جو اسے آئندہ پورے سماج کے لیے اور خاندان کے لیے اور انسانی رشتوں کے لیے مہلک بنا سکتا ہے۔

اسلام نے رشتوں کی حرمت پر مختلف پیرایوں میں اسی بنا پر تاکید کی ہے کہ یہ سماجی اور عائلی نظام کو صحیح نہج پر قائم رکھنے کا ضامن ہے۔ اس کی خلاف ورزی سے جو انتشار انسانی معاشرے میں پھیل سکتا ہے اس کی مثالیں ہمارے سامنے آتی جا رہی ہیں۔ والدین اگر اس کا خیال رکھیں کہ بچوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے ہو کہ وہ ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو کریں، ان کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھیں اور مناسب انداز میں اصلاح کریں، انسانی رشتوں کی نوعیت انہیں سمجھائیں اور اس کی سماجی اور مذہبی معنویت آہستہ آہستہ ان کے ذہن نشین کرائیں۔ □

ان اقدار میں سر فہرست انسانی رشتوں کا احترام ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ اگر اس زمین پر ایسے افراد کا ایک معاشرہ قائم ہو جائے جو رشتوں کی حرمت سے بے نیاز ہو تو انسان کیا بہیمیت اور وحشی کی زندگی کے دور میں واپس نہیں چلا جائے گا؟

عورت پر فرض ہے کہ وہ شوہر کے ساتھ رہے

آپ کے سوال اور ان کے فقہی جوابات

سوال شادی کی پہلی رات میں بہت سے نوجوان حیرت و تردد کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اس رات زوجین کو کیا کرنا چاہیے؟

جواب شب زفاف میں ایک ضروری امر جس پر توجہ دی جانی چاہیے یہ ہے کہ شوہر بیوی کو خوش کلامی و خندہ پیشانی کے ذریعہ اپنے سے مانوس کرے اور اس کی پیشانی پکڑ کر دعائے ماثورہ "اللھم انی اسئلک خیرھا وخیر ما جبلتھا علیہ واعوذبک من شرھا وشر ما جبلتھا علیہ" پڑھے اور جنسی عمل سے پہلے بھی وہ کلمات کہہ لینے چاہئیں جن کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب تم میں کوئی اپنی بیوی سے جنسی عمل کرنا چاہے تو وہ یہ کلمات ادا کرے **بسم اللہ اللھم جنبنا الشیطان وجنب الشیطان مارزقتنا**" اس سے پیدا ہونے والے بچہ کو شیطان کچھ نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ بچوں کے سعادت مند اور صالح ہونے کے اسباب میں سے یہ ایک بہت اہم سبب ہے۔ جو بہت ہی آسان اور سہل بھی ہے۔

سوال، بعض لوگ اپنی بیویوں کو اپنے اوپر حرام کرلیتے ہیں، تو کیا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے بستر میں اسے شریک نہ کرے؟

جواب بیوی کو حرام کرلینا ایک نامناسب بات ہے۔ کیونکہ اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عتاب کے انداز میں یہ کہا تھا کہ اے نبی تم اپنے اوپر وہ چیز کیوں حرام کررہے ہو جسے اللہ نے آپ کے لیے حلال کیا ہے (سورہ تحریم) بیوی کو حرام کرلینا قسم کے حکم میں شمار کیا جائے گا۔ لہٰذا اگر کوئی شخص یوں کہے کہ اگر میں فلاں کام کرلوں تو میری بیوی مجھ پر حرام ہے۔ اور وہ کام کر گزرا یا یوں کہے کہ اگر میں فلاں کام نہ کروں تو میری بیوی مجھ پر حرام اور وہ کام نہیں کیا تو ایسی صورت میں قسم کا کفارہ واجب ہوجائے گا۔ البتہ بیوی حرام نہ ہوگی۔

سوال مرد اور عورت کے درمیان بستر کی شرکت کے حدود کیا ہیں؟

جواب اللہ نے سورہ مومنون میں فرمایا ہے "اور وہ لوگ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، اپنی بیوی اور باندیوں کے علاوہ کیونکہ ان کے ساتھ جنسی عمل کرنے میں ان پر کوئی ملامت نہیں۔ اسی آیت میں صاف طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ مرد پر اپنی بیوی سے جنسی عمل کرنے میں کوئی ملامت نہیں۔ اسی طرح حالت حیض میں بیوی سے لطف اٹھانے کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا



کہ مباشرت کے علاوہ جو چاہے دونوں کرسکتے ہیں۔ حالت حیض میں اور حالت نفاس میں مباشرت جائز نہیں۔ اسی طرح سے پچھلی شرمگاہ میں بھی وطی جائز نہیں۔

سوال جب شوہر بوڑھا ہوجاتا ہے تو بہت سی عورتیں اس کے حقوق کی ادائیگی میں غفلت و سستی برتنے لگتی ہیں یہاں تک بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ شوہر سے دور رہنے کے مقصد سے وہ بچوں سے ملنے کا بہانہ بناکر سفر پر نکل کھڑی ہوتی ہیں۔ اس بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

جواب عورت پر اپنے شوہر کے حقوق کی ادائیگی سے پہلوتہی برتنا جائز نہیں۔ شریعت کی رو سے عورت کا فرض ہے کہ وہ شوہر کے ساتھ رہے، اس کی اجازت کے بغیر دور یا قریب کہیں کا سفر نہ کرے۔ اگر بعض عورتیں اپنی اولاد کے ہاں قیام کو بہانہ بناکر اس کی خدمت سے بچ جانے کی کوشش کرتی ہیں تو یہ چیز ان کو اللہ کے یہاں مستحق عتاب بنا سکتی ہے۔ اسی لیے ان چیزوں سے بچتے ہوئے اسی کے ساتھ رہنا چاہیے، اسی کی خدمت کرنی چاہیے۔

سوال کبھی شوہر اور بیوی کے درمیان خواتین کی بعض ناپسندیدہ حرکات کے سبب کشیدگی ہوجاتی ہے اور بیوی شوہر کے مطالبہ پر جنسی عمل پر آمادہ نہیں ہوتی۔ اس سلسلہ میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب شوہر بیوی کو اپنے بستر کی طرف بلائے اور وہ انکار کردے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح مرد کو چاہیے کہ عورت کی بعض کجیوں کے باوجود خوش گواری کے ساتھ رہے اور خوش دلی کے ساتھ وظیفہ زوجیت ادا کرے۔ کیونکہ عورت عقل و تفکیر اور دینی طور پر ناقص ہوتی ہے۔ اگر مرد اس کے نقص کو دور کرنے جائے گا تو وہ اسے توڑ دینے کا باعث بن جائے گا اور اصلاح کسی کے لیے ممکن نہ ہوگی، جیسا کہ حدیث میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے۔ ▭

میرے بھائی نے میرا مال غصب کرلیا ہے

اگر آپ کسی الجھن میں ہیں یا کسی اہم فیصلے لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں جس سے آپ کی زندگی کا سکون درہم برہم ہوگیا ہے تو آپ فوری طور پر ہمیں اپنے مسائل سے آگاہ کریں۔ ہم اس کالم میں آپ کی نفسیاتی الجھنوں کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

سوال کئی سال پہلے کی بات ہے کہ اپنی کمپنی کے ایک ملازم ساتھی سے رفتہ رفتہ میری راہ و رسم اتنی بڑھی کہ آپس میں دوستی ہوگئی اور مجھے اس پر حد درجہ اعتماد ہوگیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں ایک کاروبار میں پیسہ لگا رہا ہوں تم بھی اس میں شریک ہوجاؤ۔ میں دوستی پر بھروسہ کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً اسے پیسے دیتا رہا کہ وہ کاروبار میں لگائے۔ چند برس جب گزر گئے تو میں نے دوست سے کہا کہ اب تک جو رقم اس کے پاس پہنچ چکی ہے اس پر ہونے والے منافع میں سے میرے حصے کی تخصیص کردے تو اس پر اس نے صاف طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ اب میں یہ سوچ کر پریشان ہوں کہ منافع تو دور کی بات ہے کہیں میری اصل رقم بھی ڈوب نہ جائے۔ دوست کے اس رویے سے اس پر میرا اعتبار اٹھتا جارہا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ اس سے آئندہ کوئی معاملہ نہ رکھوں۔ آپ سے اس سلسلے میں مفید مشورہ کی درخواست ہے۔

محمد ابراہیم۔ بھساول

جواب آپ نے نماز جمعہ کے خطبے میں سنا ہوگا "**یا ایہا الناس تعاشروا کالاخوہ وتعاملوا کالاجانب**" "یعنی بھائیوں کی طرح مل جل کر رہو اور معاملات میں ایک دوسرے سے اجنبیوں جیسا برتاؤ کرو۔ آپ کو درپیش مشکل کا سبب شاید یہ ہو کہ بہت سے لوگوں کی طرح آپ کو بھی اس کا علم نہیں ہے کہ معاملہ کسے کہتے ہیں۔ اسے عموماً اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ کسی فائدے یا منافع کے لیے ایک سے زائد افراد مل کر اپنی محنت، وسائل اور رقم لگاتے ہیں۔ اس سے حاصل ہونیوالے متوقع فائدے اور نقصان میں ان کی شرکت طے شدہ شرائط کے مطابق ہوتی ہے اور وہ لوگ آپس میں خواہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں متعلقہ شرائط کی پابندی ان سب پر یکساں طور پر لازم ہوتی ہے۔ ایسی ہی شرائط کی پابندی یا ان کے انحراف کی بنیاد پر کسی شخص کو معاملے کا کھرا یا کھوٹا کہا جاتا ہے۔

جہاں تک سوال ہے آپ کے اور آپ کے کمپنی کے رفیق کار کے درمیان دوستی کے رشتے کا تو انسانی روابط کے نقطہ نظر سے دو افراد میں اتنی یگانگت پیدا ہونا بہت اچھی بات ہے۔ لیکن اس یگانگت اور اس کے نتیجے میں ایک کو دوسرے پر اعتماد سے یہ نتیجہ نکالنا کہ معاملات میں جن شرائط کی پابندی ضروری ہوتی ہے ان سے انحراف کرنا دوست یا رشتے دار کا حق ہے تو یہ بالکل غلط تصور ہے اور دیرینہ تعلقات اسی طرح خراب ہوتے ہیں۔ بلکہ لین دین میں اسی غلط تصور کی بناء پر یہ لوگ کہتے دیکھے گئے ہیں کہ تحریر و شہادت کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیں آپ پر اعتماد ہے جب کہ رسول اللہ نے فریقین کی سہولت کے لیے یہ طریقہ کار نکالا تھا کہ معاملات میں ایک شخص دوسرے پر زیادتی نہ کرسکے۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ آپ کے دوست نے کس طرح کے کاروبار میں روپیہ لگانے پر آپ کو آمادہ کیا تھا، کیا وہ خود کوئی سامان تجارت خرید کر لاتا تھا اور منافع کے ساتھ فروخت کرتا تھا یا کسی تاجر کو دیتا تھا جو رقم اپنی تجارت میں لگاتا ہو اور مجموعی رقم کا منافع آپ کے دوست کو دے دیتا ہو۔ کاروبار کی نوعیت جو بھی رہی ہو آپ نے جتنی رقم اور جتنی بار اور جس مقصد کے لیے اپنے دوست کو دی، اس کا تحریری ثبوت مع دستخط گواہان اپنے پاس رکھنا چاہئے تھا۔ اگر آپ کا دوست کہتا کہ آپ اس میں بے اعتباری کی بات کررہے ہیں تو اس کا سیدھا جواب تھا کہ میں وہ بات کہہ رہا ہوں جس پر عمل کی ہدایت اللہ کے رسول نے دی ہے۔ آپ کے دوست کے عمل کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جاسکتا ہے ایسے شخص کے ساتھ دوستی بڑھا کر آپ نے اچھا نہیں کیا۔ وہ کام کا ساتھی رہتا یہی بہت تھا۔ آپ سے اس آدمی کو پہچاننے میں غلطی ہوئی ہے۔ کسی بحث و تکرار سے بچتے ہوئے آپ اپنی لگائی ہوئی رقم اس کے پاس سے نکال لیں اور صبر سے کام لیں۔

سوال میرے بھائی نے میرا مال غصب کرلیا ہے۔ میں اور بھائی سولہ سال تک ایک آٹو ورکشاپ میں کام کرتے رہے۔ میں بعض فنی امور انجام دیتا تھا اور بھائی کے ہاتھ میں عام انتظام تھا۔ ورکشاپ سے خاصی آمدنی ہوتی تھی اور منافع معقول تھا۔ بس ایک بات تھی کہ میرے اپنے اخراجات بہت بڑھے ہوئے تھے اور وقتاً فوقتاً میری بیوی بھی وہاں سے پیسے منگوا لیا کرتی تھی۔ میں چونکہ کام میں مصروف رہتا تھا اس لیے میں نے اپنے بھائی سے کہا کہ میرے لیے ایک زمین کا ٹکڑا خرید دیں۔ انہوں نے زمین خریدی اور اسے اپنے نام رجسٹرڈ کروائی۔ چند سال گزرنے پر میں نے وہ رجسٹری اپنے نام منتقل کرانے کے لیے جب ان سے کہا تو انہوں نے انکار کردیا۔ اب میں نے ان سے علیحدہ ہونے کا پورا ارادہ کرلیا اور ورکشاپ بھی اسی بات پر بند ہوگئی۔ جب میں نے

باقی صفحہ ۴۷ پر

رسولؐ اقدس کی شان میں ایک اور گستاخی

جرمن زبان میں شایع ہونے والی کتاب "ہٹلر کے مددگار" پر ایک تبصرہ

اسلام اور نبی اسلام کے سلسلہ میں یہودیوں کی بے ہودہ گوئی و افترا پردازی مسلمہ و مشہور ہے۔ حال ہی میں شایع ہونے والی ایک یہودی کتاب میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہود کی ہفوات تمام حدود کو تجاوز کرگئی ہیں۔ آج کل جرمنی میں "ہٹلر کے مددگار۔ یہودیوں کے قتل کے لیے ہٹلر کو کس نے ابھارا؟" کے ٹائٹل کے ساتھ ایک کتاب نہایت ارزاں داموں پر فروخت کی جارہی ہے۔ جرمنی ٹیلی ویژن کے ایک چینل نے اس کے بعض اقتباسات بھی پیش کئے ہیں۔ جرمنی کے بعض مسلمان صحافی اس کا جواب لکھنے کے سلسلہ میں غور کررہے ہیں۔

کتاب کا یہودی مصنف یہ دعوی کرتا ہے کہ ہٹلر نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا تھا اور محمد نے یہود کے ساتھ جو معاملہ کیا تھا اسی سے یہودیوں کے تئیں ہٹلر کے انتہا پسندانہ خیالات کو تقویت ملی، نیز یہ کہ دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر نے یہودیوں پر جو مظالم ڈھائے اس میں اسے فلسطین کے مفتی اعظم محمد امین الحسینی اور دوسرے مسلمان سیاسی رہنماؤں کا تعاون بھی حاصل تھا۔ خیالی دنیا میں پرواز کررہے متعصب یہودی مصنف نے یہ دعوی بھی کیا ہے کہ مسلم تنظیمیں یورپ کے اندر یہودیوں کی مخالفت میں دائیں بازو کی جماعتوں کے ساتھ کام کررہی ہیں۔ مصنف نے اس سلسلہ میں جرمنی یونین برائے داخلی امن و سلامتی کی فراہم کردہ معلومات کو اپنے مزعومات کی اساس بنایا ہے۔ واضح رہے کہ مذکورہ یونین کے صدر یورگن پیریشس جرمنی کے مسلمانوں سے شدید مخاصمت رکھتے ہیں اور ان کا کہنا یہ ہے کہ مسلم تنظیمیں نئے نازیوں کے ساتھ مستحکم روابط رکھتی ہیں۔ اسی پیریشس نے بون میں منعقد ایک صحافتی کانفرنس میں یہ بھی کہا تھا کہ مسلم جماعتیں یورپی اور بالخصوص جرمن امن و سلامتی کے لیے سرخ جھنڈوں اور جرمن سرخ فوج سے کہیں زیادہ خطرناک ہیں۔ مسلم مصنف محمد جلال کشک کے سلسلہ میں کسی کتاب میں یہ لکھا گیا ہے کہ انھوں نے ہٹلر کو کعبہ میں طواف کرتے دیکھا تھا اور اسے الحاج محمد ہٹلر کا نام دیا تھا۔ اسی مفروضہ کو یہودی مصنف نے لے کر یہ دعوی کردیا ہے کہ دنیا بھر میں مسلمان ہی وہ قوم ہے جنھوں نے یہودی کے قتل عام میں ہٹلر، مسولونی اور جنرل فرانکو کی مدد کی۔

کتاب درمیانی سائز 435 صفحات پر مشتمل ہے اور اصلا ایک جرمنی صحافی کی ان تحریروں کے رد میں لکھی گئی ہے جو مجلہ Strin میں ہٹلر کی ڈائری کے عنوان سے چھپتی رہی ہے اور جن میں مذکورہ صحافی نے یہودیوں کے دوسری جنگ عظیم کے مارے ستائے ہونے کے مشہور عام نظریہ کی تردید کی ہے اور بڑی قوت کے ساتھ یہ خیال پیش کیا ہے کہ ہٹلر عالمی صہیونیت کا آلہ کار تھا اور ملکہ وکٹوریا و بالفور کے بعد فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام میں ہٹلر کا سب سے اہم کردار رہا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مذکورہ صحافی یہودی انتقام کے خوف سے جرمنی چھوڑ کر ہالینڈ میں پناہ لینے پر مجبور ہوگیا جہاں وہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہا ہے۔ ▭

بقیہ: الجھن

ورکشاپ میں سے اپنے حصے کا مطالبہ کیا تو جواب ملا کہ ورکشاپ میں تو گھاٹا ہوگیا ہے اور نہ ہی اتنی نقد رقم ہے جسے آپس میں تقسیم کیا جاسکے بلکہ بعض واجبات انہوں نے مجھ پر ہی قائم کردئے۔

فخرالدین۔ کاسگنج

جواب اس طرح کی مشکلات بیشتر ان لوگوں کو پیش آتی ہیں جو اپنے معاملات میں آپسی قول و قرار کو ضابطہ تحریر میں نہیں لائے اور اسے معلق چھوڑ دیتے ہیں بغیر یہ سوچے کہ وسوسے اور طمع ہر وقت انسان کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔ آپ نے جب ورکشاپ کا کام بھائی کے ساتھ شروع کیا تھا تو اس میں شرکت کی نوعیت اور دونوں افراد کی ذمہ داریوں کی وضاحت ایک معاہدہ عمل کی صورت میں ہوجانی ضرور تھی تاکہ صرف آپ کے ہی حقوق کا نہیں بلکہ آپ کے بھائی کے حقوق کا بھی تحفظ ہوسکے۔ دوسری غلطی یہ ہوئی کہ وہ کاروبار جو آپ کے بھائی اور آپ کے درمیان تھا اس میں سے آپ کی اہلیہ وقتاً فوقتاً پیسے منگواتی رہیں اور اس کا کوئی حساب بھی نہیں رکھا گیا۔ یہیں سے آپ کے بھائی کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ ورکشاپ میں گھاٹا ہوتا رہا ہے۔ جو زمین آپ نے ان سے کہہ کر خریدوائی تھی وہ تو خیر ہاتھ سے نکل گئی اب ورکشاپ کا اثاثہ اور اس کی زمین کے بارے میں یہ ہوسکتا ہے کہ سولہ سال تک آپ دونوں اس میں کام کرتے رہے ہیں تو اپنے قریبی ذمہ دار افراد کو بٹھا کر اس کا آپس میں تصفیہ کرلیں۔ اگر وہ ورکشاپ موروثی تھی تو تقسیم میں کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہئے۔ آپ کی اسے سولہ سال کی وابستگی کے پیش نظر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اکیلے بھائی اسے کیسے بیچ لیں گے۔ ▭

Compound interest

In the Capitalist world, interest must be paid on debt. Now, unless a country is running a trade surplus, it must borrow the funds necessary to make interest payments. Thus the annual amount that must be borrowed gets larger and larger, even if the trade deficit itself does not expand. As debts grow, interest payments grow. As interest payments grow, debt grows. As time passes the rate of debt accumulation speeds up, even if the basic trade deficit remains constant. This magic of compound interest is that it ensures that almost all of the 'Third World' countries will alaways remain in debt. To illustrate with numbers, $1 trillion dollars compounded at 10% per year will become $117 trillion in fifty years and $13.78 quadrillion in one hundred years. This would correspond to about $3.5 million for every man, woman, and child in the 'Developing World'. But their debt is twice this and has been compounding at twice that rate - over 20% per year between 1973 and 1997, from under $100 billion to $2 trillion. Most of these debts are incurred without the recipient country receiving any lasting benefits. In fact, only about $400 billion of that $2 trillion debt was actual borrowed finance capital; the rest was runaway compound interest.

The Islamic Perspective

The taking of foreign aids/loans by the Islamic State could be haram or mubah depending on the strings attached. Firstly, if it comes with interest, it becomes haram as Allah (swt) has forbidden interest. But even if this could be circumvented somehow, it does not automatically become permitted by Islam. The reason is that it could bring harm to the state's authority, its economy and its security. This is based on the Shari'ah principle which states that if any particular action that is allowed (mubah) leads to harm then this individual action becomes haram.

The curse of foreign aid

The clear and present danger of foreign loans is that they constitute a sophisticated war tool that has been used historically and is still being used to control debtor states. Strange as it may sound, one of the goals of the leading mercantilist nations is to sell as many consumer products as possible to an enemy, while embargoing machinery and technology, so as to keep them dependent and weak. High priority is placed on selling to any society that is an ideological threat, as is the case between Islam and the West. The resulting inability of the dependent society to develop its own skilled labor, innovations, industry and wealth, is well understood. Modern aid is intended by 'Developed Countries' to perpetuate the above. Additionally, as the debt grows to unrepayable levels, the debtor country becomes permanently enslaved with the creditor country invoking all sorts of rights to intervene.

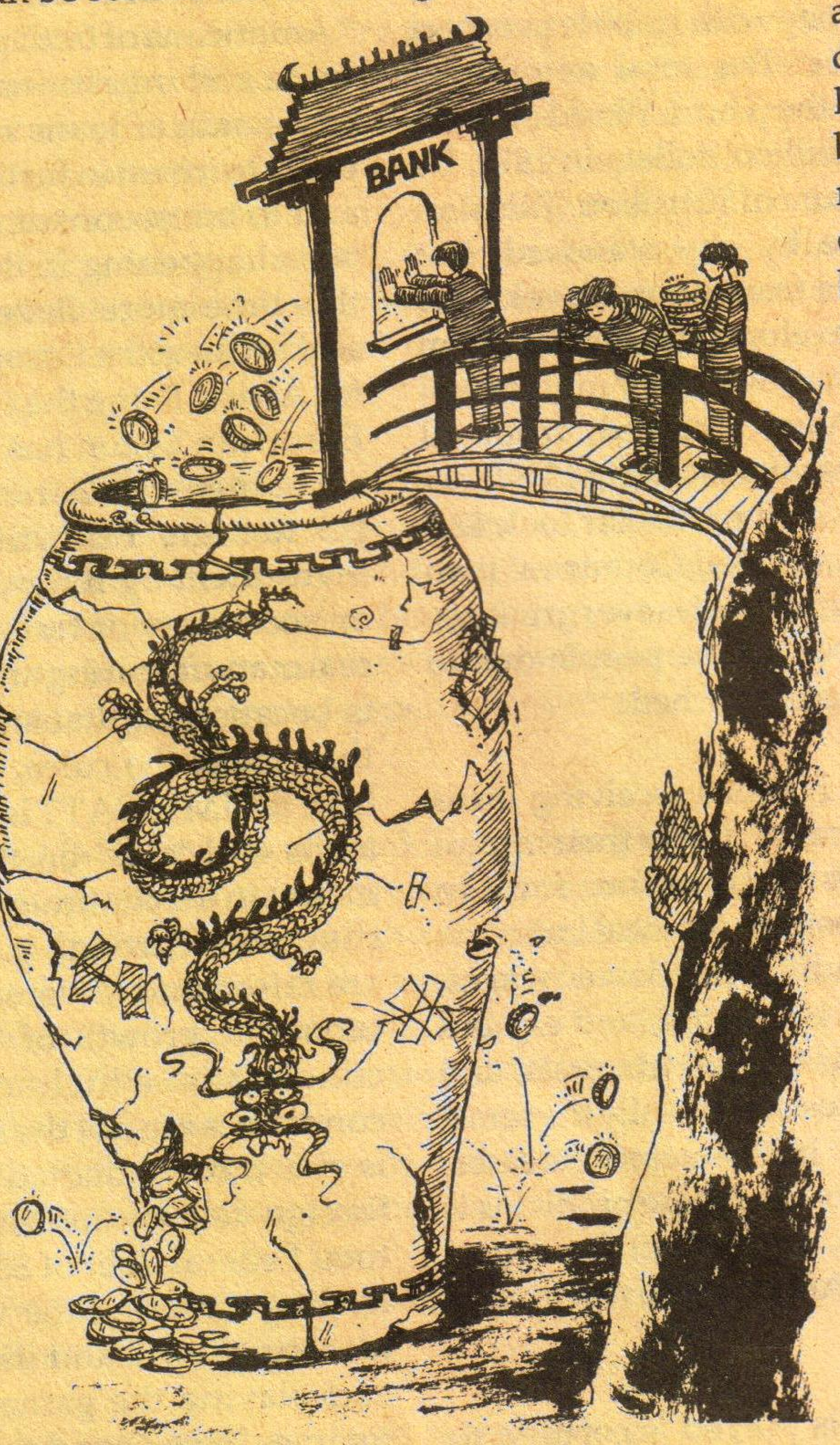
England colonized Egypt through debts. Under the pretext of recouping their loans, an English administrative officer was sent to supervise public revenues and a French one to supervise expenditure. This developed later to establishing a mixed cabinet, with the English in the ministry of Finance and the French in the ministry of works. Through this, Egypt was colonized. In a similar way, France also occupied Tunis through debts. But most telling was the establishment of the Ottoman Debt Council (1881-1944) through which the Western states extended their direct influence on the Khilafah in its last days.

What is most likely to happen today or in the future is that international bodies will be used to control the Khilafah if it falls into the debt trap. This was what happened to the lesser European states during the inter-war period, especially Austria, Hungary and Greece, when international financial control was established by the League of Nations over them. The modern equivalent of the 'League of Nations', the UN and its daughter organizations such as the IMF and the World Bank, are already doing the job. These are in fact tools in the hands of the rich Western nations. Notwithstanding this, if the Khilafah evaluates that none of the above dangers exist, taking a loan, without interest, would be permissible.

Conclusion

The Islamic State is and must be an ideological nation. Since it is clear that such interventionist actions as outlined above are motivated by political and ideological considerations, it must steer clear of this danger. As has been proven in many historical cases, these debts are not absolute necessities for advancement. On the one hand, there are countries especially in the Muslim World that are even richer than their Western masters, and yet they are so technically backward that they cannot even defend their borders. On the other hand, there have been many examples of countries which were boycotted and actually ended up better off in terms of developing their own resources while countless more that were tempted or coerced to keep borrowing ended up worse off. The lesson stands that the most important tool of advancement is the ideological and political will of a nation rather than anything else.

But the bulk of the projects are not addressing the fundamental requirements of these nations. They often involve the construction of infrastructure and production systems that benefit the creditor nations of the West far more than the debtor. These include large irrigation dams as in the case of Morocco or power plants supplying non-domestic electricity as in the case of Zaire and arms to keep ailing dictatorships in power. At face value, these projects may seem very beneficial to the borrowing 'Third World' country. But the actual consequence of the borrowing can be seen as follows:



The loan is provided on the basis of regular interest payments. These loans have to be paid back in Dollars or Pound Sterling, and to earn this currency, the borrowing country needs to export goods, or to purchase foreign currency on the international market. In order to achieve this, government expenditure on basic necessities such as food and other commodities is diverted to other products such as cash crops that can be sold on the international market for the desired currency. These crops are usually produced by many other debtor nations, resulting in low market prices. At the same time, due to the emphasis on cash crops and the like, the borrowing country has not invested in developing its own agricultural base for feeding its population. Consequently, it needs to purchase its food from the 'First World', thus living at their mercy; and to do that it needs to borrow. Then the cycle begins all over again. When the borrowing nation defaults or is in danger of doing so, the IMF is invoked. The IMF has one and the same solution to all such problems, - the imposition of austerity measures designed to increase foreign exports and reserves in order to make more payments. This means more suffering and poverty for the people.

The poor borrow their own money

This is a well-known phenomenon to American bankers. They take funds that 'Third World' elites have appropriated from their countries and loan them back to countries for supposedly productive uses, earning a nice spread each way. These banks are adept at designing complex schemes to help their wealthy clients ferry money out of their country's offshore trusts, fake investment companies, parallel foreign exchange swaps that avoid national banks, and 'back to back' loans in which the bank 'loans' the client his own money. Their inventiveness is amazing! The big western banks in the game have whole departments dedicated to this, with agents world-wide. One dollar out of every three loaned to Latin America by banks between 1979 and 1983 made this round trip. It was estimated that a net of $418 billion of borrowed funds flowed right back between 1982 and 1990. This is more than double that was spent to rebuild Europe after World War II. This wealth that is skimmed off by the elite of Developing Countries and deposited in foreign banks, is a large factor in the developing world's debt burden.

Compulsory purchase

Another mechanism for ensuring Third World debt is that they are almost without exception tied to import from the donor country. These types of bondage deals are usually done discretely. To cite an example of one such deal that became public in 1988, George Younger, the British Defense Secretary, signed a deal with Malaysia linking $1 billion in arms sales with an aid package to build the Pergau Dam. More generally, it has now become a common practice for Western companies to persuade poor countries to buy their goods and services even if they don't have money to pay. They make it part of the deal that they will secure aid on their behalf from their country or a loan from the World Bank or any such bodies. Hence the money simply remains in the donor country. It is reported that over 80% of America's foreign aid returns immediately through exports tied to that aid.

'Developing Countries' and the International Debt Game

Never in the history of humankind have so many countries owed so much money with so little prospect of ever getting out of debt. The total amount of international debt owed by the Third World nations amounted to just under 100 billion dollars in 1973. By 1997, it stood at a staggering sum of $2 trillion. This sum of money is certainly large by any standard. But ironically, more money flows from poor 'Developing Countries' into the richer 'Developed Countries', than is given back in aid and new loans. Since 1987 multilateral institutions like the IMF have received, from all 'Developing Countries', net transfers of over $13 billion. Between 1983 and 1993 the IMF in particular took $2.9 billion more from the less 'Developed Countries' than it gave in new loans. 'Third World' debt is ever growing, with devastating consequences on the people due to structural adjustment conditions attached.

The strings attached to loans Nations receiving loans are asked to, devalue their currency, lower their import barriers, remove their restrictions on foreign investments, remove their subsidies for local industry, lower their social welfare funding, pay lower wages, reduce government spending in general, and expand production and export of their timber, minerals, and agriculture. The results are almost universally the same, wages fall, poverty worsens, health care decreases, education decreases. Adding to all of these problems is the purpose of all the changes, the price of the export commodities are forced down. And then the real trouble cycle begins.

The international debt game is played according to an upside down logic, that one would think would be blatantly obvious to all. But it continues like an endless chess game with pawns continuously placed in strategic positions in order to be sacrificed to keep bishops and kings going. In his recent tour of Africa, President Clinton made a move to place Africa in a strategic position in the American plan. After admitting that "For centuries, other nations exploited Africa's gold, Africa's diamonds, Africa's minerals...". He coloured his speeches with phrases like "It is time for Americans to put new Africa on our map", "Now Africans are embracing economic reform", "Americans of both political parties want to increase trade and investment in Africa...". These amount to an agenda of loans and 'aid' to African countries in order to invest in further exploitation of raw materials and to boost consumption of US products. This has been happening in the same way for centuries, only this time more cleverly so. President Clinton only seeks to beat the European Union in the new scramble for Africa. Being the biggest competitor to the US, the European Union has announced its own "economic encounter with Africa" in the year 2000. Neither the US nor the EU will offer to increase trade and investment by removing their unfair trade barriers on secondary or tertiary products or by investing in real manufacturing and industrial development. This is because Capitalism is the rule of the game, and they make the rules, using instruments like GATT. Like the IMF, GATT is a crucial tool in the game, since loans and 'aids' on their own are not sufficient to maintain the continuous exploitation of 'Third World' countries. Through it, strategically selected barriers are raised and lowered in such a way as to steer the economic growth of 'Third World' nations. These conditions which complement the IMF loan conditions are not the same for the powerful. The US is the most indebted country in the world, with foreign debt amounting to about $1.5 trillion out of a total Federal debt of $5.5 trillion. Yet it stands as the leading nation of the world due to its political and ideological will and its influence in setting the rules and playing the game. The existing 'Third World' regimes have abandoned their political will in order to pursue these structural adjustment policies and therefore have little prospect of ever getting out of the vicious cycle. In the following paragraphs, we analyze how the international debt game is played, its implications and consequences and the Islamic viewpoint on it.

The ends do not justify the means

The reason why 'Third World' countries borrow at the international level is to finance projects in the country.

basic issues about the methodology of change. Though knowing well about their society and the nature of change that they are working for, they are yet to shed their alien apprenticeship for change; either acquired in the West or somehow crept up in their 'Islamic' thought. What probably they need is a thorough revision of the vision as well as of the strategy. Only then their dream for a just world order can become a feasible idea.

Away from the western and the Muslim world, dreamers, visionaries, utopianists and activists sharing the dream of a better world also live in the Confucian and the Buddhist worlds. Not only clear symptoms of changes have been witnessed in these countries during the last few years but also some influential writings have come from these traditions, attacking at the very root of the dominant civilization.

The need for an alternative, then, is the rallying cry today. Thinking individuals and groups, no matter located in the East or West, linked up with a religious tradition or bare agnostics - are desperately looking for an alternative. Trapped in a unipolar world-system aided and supported by a mad, cruel and directionless technological civilization, we do not know if an escape is at all possible. Even those enjoying the advantages of the unipolar system have the strong feeling that they have missed something higher, something noble and lofty and that they must look for it somewhere else. The better-world visionaries, irrespective of their ideological lineage, have a common concern, a common agenda to shape a better tomorrow. Why not then make a concerted effort or, atleast, share experiences and benefit from each other's vision.

Never before was there such a dire need to look for an alternate world system, never before the human world was so exposed to the dangers of an ideological vacuum, and never before the degree of conceptual confusion about the desired change and its methodology ran so high among the exponents of a better world, as today. As a preliminary step towards a better future, we, all concerned and thinking men and women, need to sharpen our vision. There must be a forum where our supposedly 'sound' ideas are open for criticism and we too in the process become so open as to welcome any light no matter from whichever direction it comes.

The Milli Times International (MTI) invites all thinking men and women to come up with their vision of a just world and the methodology involved in bringing about such a change. We intend to make the MTI a truly international forum, a guiding light for all those trying to bring a new order to our troubled world. The 'bigness' of the issue and the 'vastness' of the agenda will involve us in an interdisciplinary debate. Prominent activists of different hue will also share with us the story of their success and failure, their frustrations and anger and, amidst all that, the illusion and hope that help them keep up their good work. The MTI, then, will be a forum for world revolutionaries, visionaries, day-dreamers, policy-makers, politicians, religious leaders, ruling elite and much more, for the concerned individuals. At the MTI we inted to make our humble efforts to give our globe a human direction.

We therefore warmly invite you to share our concern. Hope your contribution will be a timely note, a right step towards the attainment of our goal.

With all good wishes and happy tomorrows from New Delhi.

Your brother,

Rashid Shaz

Dr. Rashid Shaz
Chairman
Muslim Media Trust

RNI #57337/94

THE MILLI TIMES INTERNATIONAL

Jamia Nagar, New Delhi - 110025, Tel. : +91-11-6827018, 6926246
E-mail: militime@de13. vsnl. net. in, Fax: +91-11-6946686

Vol.V, No. 4 July, 1998

An Invitation to Think!

Dear friend,

Assalamo Alaikum wa Rahmatullah

In the contemporary world there is a common feeling that ideologies have failed us. All our efforts to create a better world in which peace and prosperity may prevail have eventually led us to a point where we have lost control over the course of events. The situation is the same as related to Mulla Naseeruddin in a traditional Persian tale. As the story has it, once the Mulla was running after his donkey trying to get hold of him. And while he was running a person in the street asked him, O Mulla! where are you up to? To this the Mulla replied: "don't ask me, ask the donkey". We all, men and women of today, are running after the donkey of modern-day technology knowing not where this donkey is taking us to.

The fall of the Soviet empire has created yet another vacuum in the world of alternatives. The failure of communism has cast strong doubts about the future of rival ideologies too. Those living in the capitalist societies are no more complacent about the systemal behaviour of capitalism. Serious enquiries into some basic and inherent flaws of the system have already started leading men and women to look for better alternatives. And while the dominant civilization is working for major repairs as part of survival measures, its 'civilizational force', nevertheless, has threatened it from within. In the West, the growing dissatisfaction about its own socio-ethical norms and the revival of interest in the religious, conservative or third world social values have further emphasised the need for some major repairs in the socio-ethical fabric of the seemingly better off societies. Needless to emphasise, the real threat to western civilization is from within, from its own 'civilizational force' which is trying to change its course to such an extent that it may not remain, or at least appear, essentially western. The influence can be traced to any where. What is important is the fact that a real melting pot is coming into existence, perhaps for the first time in human history.

But events of far-reaching significance are not taking place in the western world alone. Strong voices for a systemal change are also coming from the Muslim world where the 'Fundamentalist Islam' has gained considerable strength. In some parts of the Muslim world populist movements are fighting against the pro-western regimes, trying to create an 'Islamic order' in their own homelands. This phenomenon is seen in the West as a part of the power game, an 'Islamic' attempt to challenge western hegemony, a well-thought out 'conspiracy' to take-over the world leadership. For the Muslim Ulema and intellectuals do not limit themselves to the welfare of the Muslim world alone, they talk of a global brotherhood and feel responsible for the salvation of the global human community. But despite their programme for a global welfare and their restlessness to give a new direction to the aimless drift of the dominant civilization, leadership in the Muslim world has a great sense of failure in gaining control over the course of events in their own homelands. Leaders in these countries are a confused lot, knowing not how to address some